تدبّر
لاہور

جاری کردہ:

مولانا امین احسن اصلاحی

مدیر:

خالد مسعود

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبّرِ قرآن و حدیث

لاہور۔ پاکستان

تدبّر لاهور

جاری کردہ

مولانا امین احسن اصلاحی

مُدیر:

خالد مسعود

شمارہ 80

جون 2003ء

ربیع الثانی 1424ھ

فہرست

تذکرہ وتبصرہ

فراہی کتب فکر اور خدمت حدیث خالد مسعود	2

تدبر قرآن

تفسیر سورہ بقرہ (۳) حمید الدین فراہیؒ / ڈاکٹر عبید اللہ فراہی	6

تدبر حدیث

درس صحیح بخاری .... امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی	15
درس موطا امام مالک............ امین احسن اصلاحی / ماجد خاور	28

مقالات

بت پرستی کی تاریخ / محبوب سبحانی	41

مراسلہ و مذاکرہ

کیا انسان مجبور ہے یا با اختیار امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی	46

اشاریہ مضامین

"تدبر" شمارے 71 تا 80	53

مجلس ادارت

عبداللہ غلام احمد (مدیر مسئول)

محبوب سبحانی

سعید احمد

سید اسحاق علی

قیمت 12.50 روپے

سالانہ 50.00 روپے

بیرون ملک 250.00 روپے

(ماسوائے برصغیر)

ناشر: ادارہ تدبر قرآن وحدیث رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، سمن آباد، لاہو

E.Mail: Taddabbur@ Hotmail.com

قرآن حکیم

- نفیس کتابت
- سلیس ترجمہ : مولانا امین احسن اصلاحی
- حاشیہ : مشتمل بر اخذ و تلخیص از تفسیر تدبر قرآن، خالد مسعود
- سفید زمین اور نیلے حاشیہ کے ساتھ عمدہ طباعت
- خوبصورت جلد اور کور
- سائز 20X30/8 صفحات 1008 قیمت 550 روپے

ناشر: فاران فاؤنڈیشن 122 فیروز پور روڈ لاہور

1- تدبر حدیث شرح صحیح بخاری (جلد اول)

2- تدبر حدیث شرح موطا امام مالک (جلد اول)

از

مولانا امین احسن اصلاحی

- ترتیب و تدوین : خالد مسعود، سعید احمد، سید اسحاق علی
- فہم حدیث کا ایک نیا انداز
- خوبصورت طباعت و جلد بندی
- سائز 20X30/8 صفحات 580, 544
- قیمت: 360 روپے، 350 روپے

ناشر: ادارہ تدبر قرآن وحدیث، رحمان سٹریٹ مسلم روڈ، سمن آباد لاہور

ملنے کا پتہ: دار التذکیر رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

خالد مسعود

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فراہی مکتب فکر اور خدمت حدیث

حمید الدین فراہیؒ علامہ شبلی نعمانی کے عزیز اور درس نظامی میں ان کے شاگرد تھے۔ شارح حماسہ فیض الحسن سہارن پوری سے انہوں نے اعلیٰ عربی ادب پڑھا۔ جدید علوم کی تحصیل کے لیے علی گڑھ کالج میں داخلہ لے کر گریجوایشن کی۔ اس کے بعد زندگی بھر ان کے مطالعہ اور فکر و تدبر کا محور قرآن حکیم رہا جس میں انہوں نے اس کی مشکلات کو حل کیا۔ تفسیر بالرائے، جس کی ایک مثال ان کے سامنے سر سید احمد خان کی تفسیر کی صورت میں آئی، کا توڑ کرنے کے لیے انہوں نے تفسیر قرآن کے اصول تجویز کیے اور ضروری قرار دیا کہ اس میں قرآن کے الفاظ کے معروف معانی، اسالیب کلام، آیات کے سیاق و سباق اور نظائر اور سورتوں کے اندرونی نظم کی پیروی کا اہتمام کیا جائے۔ اس طرح قرآن پر تدبر کے نتیجہ میں تاویل کے اختلافات سے بچ کر واحد تاویل اختیار کرنا ممکن ہوتا ہے، نیز قرآن کی اصل حکمت سمجھ میں آ جاتی ہے۔ مولانا فراہی نے اس بات پر بھی زور دیا کہ تمام دینی و عمرانی علوم کو قرآن کے تابع کر کے از سر نو مرتب کرنا چاہیے، مدرسہ کی تعلیم میں قرآن کو بنیادی اہمیت دے کر دوسرے علوم کے لیے اسی کو کسوٹی بنانا چاہیے۔ اس تجویز کے عملی مظاہرہ کے لیے انہوں نے اپنے دیار کے ایک مدرسہ کا انتظام سنبھالا، اس کے نصاب میں پورے قرآن کے تحقیقی مطالعہ کو اہمیت دی اور وہاں کے اساتذہ کو تربیت دی تاکہ وہ دوسرے علوم قرآن کی روشنی میں پڑھانے کے قابل ہو جائیں۔ مدرسۃ الاصلاح کے نام سے یہ مدرسہ سرائے میر ضلع اعظم گڑھ میں اب بھی اسی نہج پر تعلیم دے رہا ہے۔ اسی میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے تعلیم پائی، مولانا فراہی سے ان کے طریقہ تفسیر میں خصوصی تربیت حاصل کی اور ۱۹۳۰ء میں استاذ کے انتقال کے بعد شارح ترمذی مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوریؒ سے اصول حدیث اور متن ترمذی سبقاً سبقاً پڑھے۔ مولانا فراہی اور ان کے تربیت یافتہ شاگردوں کے مذکورہ انداز فکر کو 'فکر فراہی' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس فکر کی نمائندہ تفسیریں مولانا فراہی کی 'نظام القرآن' اور مولانا اصلاحی کی 'تدبر قرآن' ہیں۔

مولانا فراہی حدیث اور سنت کو رسول اللہ ﷺ کے فریضہ تعلیم کتاب و حکمت کے تحت لاتے ہیں۔ کتاب اللہ کی تبیین حضورؐ کا فرض منصبی تھا تاکہ امت کے لیے قرآن کے اشارات پر تفکر و تدبر کا منہاج

واضح ہو اور وہ اس کے ظاہری و باطنی دلائل کی روشنی میں اپنی عقلوں کو استعمال کر کے اجتہاد کے قابل ہو سکے۔ مولانا فراہی کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کو خاص نور و حکمت عطا ہوا جس کی بدولت آپ کی روح بیدار خود بھی معروف و منکر کی شناخت کا ذریعہ بن گئی۔ اس کی روشنی میں آپ اپنے الہام سے بھی احکام دیتے جن کی اطاعت امت پر لازم ہے۔

مولانا فراہی نے محسوس کیا کہ ہمارے علما حدیث اور سنت کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں جس سے لاینحل مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک سنت کے تحت وہ اعمال و افعال آتے ہیں جن کی نبی ﷺ نے امت کو تعلیم دی اور امت نے نہ صرف خود ان کو اختیار کیا بلکہ تواتر کے ساتھ اگلی نسلوں کو منتقل کرتی رہی۔ یہ اعمال و افعال امت کے عملی تواتر سے ثابت ہیں۔ چنانچہ نمازوں کی تعداد، ان کے اوقات، ان کے طریق ادا، حج اور اس کے مناسک، زکوٰۃ کے بنیادی احکام، روزہ اور اس کے آداب و شرائط، اور اس طرح کی تمام باتیں جو قرآن کے اجمالات کی عملی شرح کی حیثیت رکھتی ہیں، سنت میں داخل اور اسی طرح واجب التعمیل ہیں جس طرح قرآن کے نصوص۔ مولانا فراہی کے نزدیک دین کا تقاضا یہ ہے کہ کتاب و سنت دونوں کو لازم پکڑا جائے۔ اسی لیے وہ منکرین سنت کو باطل پر سمجھتے ہیں۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے وہ اس کو قرآن کی ایک فرع قرار دیتے ہیں کیونکہ قرآن کا متن قطعیت کے ساتھ ثابت ہے جبکہ احادیث کی روایت میں انسانی کاوشوں کو دخل ہے۔ خود محدثین کے نزدیک حدیث کی روایت میں صدق و کذب دونوں کا احتمال ہے اس لیے احادیث کے معاملہ میں صحیح و سقیم کی پہچان قرآن کی روشنی میں کرنا ضروری ہے۔ اپنے موقف کے حق میں وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ جب دو روایتوں میں تعارض ہو تو محدثین اس روایت کو قبول کرتے ہیں جو صحیح و ثابت ہو اور جس کی سند مضبوط تر ہو۔ جب قرآن اور حدیث میں تعارض واقع ہو جائے تو اس اصول پر وہ کیوں عمل نہیں کرتے جبکہ قرآن باعتبار سند زیادہ مضبوط اور قابل اعتماد ہے۔ جب قرآن اور روایت حدیث میں مطابقت کی کوئی صورت نہ نکل سکتی ہو تو قرآن کو ترجیح دینا لازم ہے۔ مولانا فراہی اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے احادیث اور کتاب اللہ کے درمیان توفیق پیدا کرنے کا عظیم دروازہ ان پر کھول دیا جس کے نتیجہ میں حضور کا کوئی حکم ایسا نہیں رہا جس میں لوگ نسخ کے قائل ہوئے ہوں اور قرآن کے ساتھ اس کی موافقت نہ دکھائی جا سکے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے اپنے استاذ کی فکر کو آگے بڑھایا، ان کے نقطہ نظر کو مفصل و مدلل کر کے پیش کیا اور اس میں اضافے کیے۔ انہوں نے حدیث اور سنت کے فرق کو واضح کرتے ہوئے بیان کیا کہ قرآن اور سنت میں تعلق روح اور قالب کا ہے۔ قرآن اصول دیتا ہے، سنت ان کو عملی زندگی میں جاری

کرتی ہے۔ ان کے نزدیک منکرین حدیث کی یہ جسارت کہ وہ قرآنی اصطلاحات کا مفہوم لغات کی مدد سے متعین کرتے اور اس مفہوم کا انکار کرتے ہیں جس کی شکل امت کے تواتر نے ہم تک منتقل کی ہے، خود قرآن کے انکار کے مترادف ہے۔ دین میں ان کا وہی مفہوم معتبر ہے جو شارع علیہ السلام نے اپنی سنت سے واضح فرمایا۔

مولانا کے نزدیک حدیث اور سنت کے درمیان فرق نہ کرنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ منکرین حدیث نے جو شبہات حدیث کے خلاف ایجاد کیے ان کو انہوں نے سنت پر بھی پھیلا دیا۔ پھر جب یہ مسئلہ مناظرہ کا موضوع بن گیا تو انہوں نے انکار سنت کر کے اپنی بات کفر تک پہنچا دی اور حامیان حدیث نے حدیث اور سنت کو ایک ہی چیز قرار دے کر سنت کو بھی ہدف پر لا کھڑا کیا، حالانکہ وہ قرآن کی طرح دین کی بنیاد ہے۔

مولانا اصلاحی کے نزدیک ذخیرۂ حدیث بڑی حد تک روایت بالمعنی پر مبنی اور اخبار آحاد پر مشتمل ہے۔ اخبار آحاد کے مفید علم ہونے کے بارے میں متکلمین کی رائے یہ ہے کہ خبر واحد مفید یقین نہیں اور اس سے عقیدہ کا اثبات نہیں ہوتا۔ محدثین اس کے مفید علم ہونے کے قائل ہیں یا اس کے مفید علم ہونے کے لیے بعض قرائن کی موجودگی ضروری قرار دیتے ہیں۔ مولانا اصلاحی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دیکھنے کی اصل چیز خبر واحد کا متن اور مضمون ہوتا ہے۔ خبر واحد بالعموم مفید علم سمجھی جائے گی لیکن اگر وہ دین کا کوئی بنیادی اور اصولی مسئلہ بیان کرتی ہو یا اس سے عقیدہ کا اثبات ہوتا ہو تو اس کی تحقیق ضروری ہوگی کیونکہ خود قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ اہم مسائل میں خبر اور خبر لانے والوں کی بابت اچھی طرح تحقیق کی جائے۔

مولانا اصلاحی حدیث کے مطالعہ کے لیے یہ تجویز کرتے ہیں کہ ایک طالب علم کم از کم موطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے ذخیرہ حدیث کی ایک ایک روایت پر تدبر کرے۔ فہم حدیث کی راہ کی الجھنوں سے بچنے کے لیے وہ چند اصول تجویز کرتے ہیں جو مختصراً حسب ذیل ہیں:

۱۔ جس طرح قرآن ہماری زندگی کے ہر گوشہ میں حق و باطل میں امتیاز کے لیے کسوٹی ہے اسی طرح روایت کی تحقیق میں بھی اصلاً وہی امتیاز کی کسوٹی ہے۔ اس کسوٹی پر پرکھے بغیر یہ امکان موجود ہوتا ہے کہ آدمی اس چیز کو دین بنا لے جو دین نہیں ہے۔

۲۔ ہر حدیث احادیث کے مجموعی نظام کا ایک جزو ہے۔ جزو کے لیے اپنے مجموعی نظام سے پوری طرح ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔

۳۔ صحیح روایت کا اس عمل معروف کے مطابق ہونا ضروری ہے جو قرآن اور سنت رسول میں محفوظ ہے۔

۴۔ ہر باب میں ان احادیث کو مقدم رکھا جائے گا جو زبان کے اعتبار سے عہد نبوت اور عہد صحابہ کی

زبان سے ہم آہنگ ہوں۔

۵۔ حدیث کے فہم میں کلام کے عموم و خصوص، اس کے موقع و محل اور اس کے خطاب کو سمجھنا ضروری ہے۔

۶۔ کسی حدیث میں اگر کوئی بات عقل کے منافی نظر آئے تو اس پر مسلسل غور کیا جائے گا یہاں تک کہ اپنا قصور فہم واضح ہو جائے یا روایت کا ضعف سمجھ میں آ جائے۔

۷۔ کسی نا تمام روایت کی تاویل اس مضمون کی دوسری روایات کے ساتھ ملا کر کرنی ہوگی۔ اس طرح جو مضمون متعین ہوگا وہ اصل ہوگا۔

ان اصولوں کا اطلاق کرتے ہوئے مولانا اصلاحیؒ نے حلقہ تدبر قرآن میں کامل صحیح مسلم اور ادارہ تدبر قرآن و حدیث میں موطا امام مالک اور صحیح بخاری کے منتخب ابواب کے درس دیے۔ ان میں الفاظ و اسالیب کی ضروری شرح، مضمون حدیث کی وضاحت اور جدید دور کے مسائل کا مواجہہ کرتے ہوئے حدیث کا ان پر اطلاق کیا گیا ہے۔ مولانا کے بیان کردہ اصول حدیث پر مبنی کتاب 'مبادی تدبر حدیث' اور موطا اور صحیح بخاری کے دروس 'تدبر حدیث' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں جبکہ ان کے باقی حصے زیر ترتیب ہیں۔

قارئین تدبر کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ سیرت النبی کے سلسلے کے جو مقالات تدبر میں ایک عرصے سے شائع ہو رہے تھے ان کو مرتب کر کے اور ضروری اضافے کرنے کے بعد اب سیرت کی ایک مکمل کتاب کی شکل دے دی گئی ہے۔ ''حیات رسول امیؐ'' کے نام سے یہ کتاب اب اشاعت کے مراحل میں سے گزر رہی ہے۔

ہمارے بہت سے کرم فرما مذکورہ مقالات کو تحسین کی نظر سے دیکھتے رہے ہیں۔ ان کا مطالبہ یہ رہا ہے کہ جلد از جلد ان کو کتابی شکل میں مرتب کیا جائے۔ اب ان کی خواہش کے پورا ہونے میں ان شاء اللہ زیادہ تاخیر نہ ہوگی اور وہ کتاب کو اپنی توقعات سے بڑھ کر پائیں گے۔

حمید الدین فراہیؒ / ترجمہ ڈاکٹر عبید اللہ فراہی

تفسیر سورہ بقرہ

-۴-

۱۵۔ الفاظ اور جملوں کی تاویل:

الٓمّٓ کے متعلق یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ اس کی تاویل بالکل واضح اور کھلی ہوئی ہے۔ یہ دراصل اس سورہ کا نام ہے۔ رہی اس کی وجہ تسمیہ کی بات تو یہ تاویل کی چیز نہیں۔ اس کا حال بھی وہی ہے جو اس جیسے دوسرے اسماء کا ہے جن کے اپنے مسمّٰی کے ساتھ خاص ہونے کی وجہ کو ہم نہیں جانتے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ نام چونکہ اللہ تعالیٰ کا رکھا ہوا ہے اس لیے حکمت سے خالی نہیں ہو سکتا، بالخصوص اس وجہ سے کہ یہ قرآن مجید کے شروع میں آیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ علماء نے اس میں غور و فکر سے کام لیا ہے اور ہم بھی اس سے متعلق باتوں کو سولہویں فصل میں بیان کریں گے۔

جہاں تک اس کتاب کی تاویل کا معاملہ ہے تو اس سلسلہ میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ جو اسماء اپنے مسمّٰی کا علم بن جاتے ہیں ان کی دلالت مسمّٰی کے کسی خاص پہلو تک محدود نہیں ہوتی بلکہ اس کے سارے اوصاف و خصوصیات اس میں شامل ہوتے ہیں۔ اس اصول پر اسم کتاب اپنے مسمّٰی یعنی قرآن مجید کے تمام اوصاف پر دلالت کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں، بالخصوص قرآن کو بہت سے ناموں اور صفتوں سے متعارف کرایا ہے تاکہ ہمارے ذہنی رقبہ کے لحاظ سے مسمّٰی کا پورا تصور ہمارے دل و دماغ میں بیٹھ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کا تعارف درج ذیل ناموں سے کرایا ہے:

ھدیٰ، بینہ، نور، بصیرت، حق، صدق، برھان، سلطان، کتاب اللہ، کلام اللہ، صحف، زبور، الکتاب، القرآن، احسن الحدیث، فصل الخطاب، بیان، موعظت، ذکریٰ، تذکرہ، نذیر، بشریٰ، شاہد، مھیمن، علی، حکیم، قیم، محکم، امام، صراط مستقیم، متشابہ، مثانی، مبارک، حکمت، روح، امر، وحی، کلمہ، ضیاء، شفاء، رزق، رحمت، رسالہ، بلاغ، ذکر، تنزیل، میزان، فرقان، تبیان اور تفصیل۔

ان کے علاوہ کچھ نام اور ہیں جو یا تو مذکورہ ناموں کے مترادف ہیں جیسے ''تورات'' جو ''فرقان'' اور ''کتاب'' بمعنی شریعت کے مماثل ہے اور ''انجیل'' جو ''بشریٰ'' کی مانند ہے یا مذکورہ ناموں سے مرکب ہیں مثلاً ''الذکر الحکیم'' اور ''الکتاب المبین''۔

اور بعض جگہوں پر اس کا تعارف کسی وصف سے کرایا ہے جیسے عزیز، مجید اور کریم اور کہیں کسی ایسے فعل سے جو کسی وصف کو بتاتا ہے جیسے محکم اور مفصل وغیرہ، اور بسا اوقات کسی حکمت کی بنا پر حروف مقطعات سے اس کو متعارف کرایا ہے جسے تدبر کی فصل میں ہم بیان کریں گے۔ یہاں ہم نے محض ان ناموں کے گنا دینے پر اکتفا کیا ہے کیوں کہ ان کے معانی کی وضاحت انشاءاللہ ان جگہوں پر آئے گی جہاں یہ آئے ہیں۔

''ذٰلک الکتاب لا ریب فیہ'' کی تاویل نویں فصل میں بیان ہو چکی ہے جس میں ہم نے بتایا ہے کہ اس سورہ میں زیادہ تر یہود کو مخاطب کر کے ان پر حجت تمام کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کتاب خشیہ میں ان سے وعدہ کیا تھا کہ ان کے لیے ایک پیغمبر ان ہی کے بھائیوں میں سے مبعوث کرے گا، اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالے گا، اس کے ذریعہ شریعت کو مکمل فرمائے گا اور ان کے دشمنوں سے انتقام لے گا۔ لیکن جو اس کی بات نہیں مانے گا اس کو سزا دے گا۔ اس پیغمبر کی خاص پہچان یہ بتائی گئی تھی کہ:

۱۔ وہ اللہ کے نام سے بات کہے گا۔

۲۔ اور جس بات کی ان کو خبر دے گا اسے پورا کر دکھائے گا۔

۳۔ اور اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک سب پر غالب نہ آ جائے۔

چنانچہ جب وہ پیغمبر ہجرت کر کے مدینہ پہنچ گیا اور وہاں کے لوگوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی اور اس کے دشمن اس کو ختم کرنے اور اس کے نور کو بجھانے پر قادر نہ ہو سکے تو یہود نے ان تمام نشانیوں کو، جو اس کے اندر بتائی گئی تھیں، بالکل سچ پایا۔ یہ سورہ مدینہ میں آپؐ کے قدم جم جانے کے بعد نازل ہوئی ہے چنانچہ جب یہود کے سامنے ''ذٰلک الکتاب'' کہا گیا تو تو گویا ان کو بتا دیا گیا کہ یہ وہی کتاب موعود ہے۔ کیونکہ یہود اس پیغمبر اور اس کتاب کے انتظار میں تھے، جیسا کہ اسی سورہ میں آیا ہے۔

وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ. (بقرہ۲:۸۹)

﴿اور جب آئی ان کے پاس ایک کتاب، اللہ کے پاس سے، مطابق ان پیشین گوئیوں کے جو ان کے یہاں موجود ہیں (یعنی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے ان کی کتابوں میں وعدہ کیا تھا) اور وہ پہلے سے کافروں کے مقابلہ میں فتح کی دعائیں مانگ رہے تھے تو جب آئی ان کے پاس وہ چیز جس کو وہ جانے پہچانے ہوئے تھے (یعنی قرآن مجید) تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔ پس ان منکروں پر اللہ کی پھٹکار ہے۔﴾

یعنی ان پر عذاب اس وعدہ کے مطابق نازل ہوگا۔

لا ریب فیه اس خبر کی تاکید کے لیے آیا ہے جو اس کتاب موعود کے متعلق سنائی گئی ہے یعنی اس کتاب کا منزل من اللہ ہونا تمام شک وشبہ سے بالاتر ہے کیوں کہ ایک تو وہ خود ہی کتاب الٰہی ہونے پر دلیل ہے اور دوسرے بچی علامات سے تم اسے اچھی طرح پہچانتے ہو۔

چونکہ خطاب عمومی نوعیت کا ہے اور خود اس کتاب سے اس کا منزل من اللہ ہونا یہود اور کفار دونوں پر ظاہر ہے اس لیے صراحت کے ساتھ وہ بات نہیں کہی گئی جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ یہ تورات میں کیے گئے وعدہ کے مطابق نازل ہوئی ہے تاکہ خطاب عام رہے اور تورات کے وعدہ کے لیے خاص نہ ہو جائے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ انجیل میں بھی کیا ہے اور حضرت آدمؑ سے بھی یہی وعدہ کیا تھا۔ اس کا ذکر "هدى" کی تاویل میں آئے گا۔

یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ لفظ کتاب کا اطلاق اکثر کتاب الٰہی پر ہوتا ہے۔ یہاں بھی اس کا یہی مفہوم مراد ہے۔ اور ہم یہ بھی کہہ آئے ہیں کہ اس کے نظائر اسی وضع پر آئے ہیں۔ پھر صحابہؓ میں قرآن کے سب سے بڑے رمز شناس حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بھی آیت کی وہی تفسیر بتائی ہے جو ہم نے بیان کی ہے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ اس کے بعد انہوں نے "الم. تَنزِيلُ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ" (سورہ سجدہ ۱:۲) ﴿یہ الم ہے۔ اس کتاب کی تنزیل، اس میں ذرا شبہ نہیں، پروردگار عالم کی طرف سے ہے﴾ پڑھا۔ ان کا طریقہ تفسیر یہ تھا کہ جب وہ قرآن مجید کی کوئی آیت پڑھ کر سناتے تھے تو اس کی نظیر میں کوئی نہ کوئی آیت پڑھ دیتے تھے۔ راویوں سے اس سلسلہ میں اکثر یہ غلطی ہوئی کہ انہوں نے اسے ان کی ایک قرأت سمجھ لیا اور یہ بات راویوں کے ان اقوال کا تتبع کرنے سے واضح ہو جاتی ہے جو انہوں نے ان کے اور دیگر صحابہؓ کی قرأتوں کے متعلق بیان کیے ہیں۔

معنوی اعتبار سے بھی قرآن مجید میں بہت سے نظائر ہیں جن سے آیت کی یہی تاویل معلوم ہوتی ہے کیونکہ متعدد جگہوں پر سورتوں کے شروع میں اسی کے مشابہ آیات آئی ہیں جو اس مفہوم میں بالکل صریح ہیں اور قرآن مجید کا معاملہ یہ ہے کہ اس کا بعض حصہ اس کے بعض کی تفسیر کر دیتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

تَنزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ. (سورہ زمر:۱، سورہ جاثیہ:۲، سورہ احقاف:۲)

﴿اس کتاب کی تنزیل خدائے عزیز وحکیم کی طرف سے ہوئی ہے۔﴾

دوسری جگہ پر ہے:

حم. تَنزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ. (غافر:۱-۲)

﴿یہ حم ہے۔ اس کتاب کی تنزیل خدائے عزیز وعلیم کی طرف سے ہوئی ہے۔﴾

ایک اور جگہ ہے:

حم. تَنزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ. (فصلت:۱-۲)

﴿یہ حم ہے۔ یہ رحمٰن ورحیم کی طرف سے نازل کی ہوئی ہے۔﴾

نیز فرمایا ہے:

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ . مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ. وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ. إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ. (نجم:۱-۴)

﴿شاہد ہے ثریا جب وہ نیچے کو آئے۔ تمہارا ساتھی نہ بھٹکا اور نہ گمراہ ہوا۔ وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا۔ یہ تو بس وحی ہے جو اس کو کی جاتی ہے۔﴾

چنانچہ یہاں پر اصل مقصود اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے کے متعلق شک کو دور کرنا ہے، نہ کہ اس کے معنوی اعتبار سے صحیح ہونے کو بتانا ہے۔

پھر تاویل کے لحاظ سے بھی یہی مفہوم زیادہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے بجائے اس کے کہ "لا ریب فیه" کو خبر اور "ذلک الکتاب" کو اس کا مبتدا قرار دیا جائے۔ بایں معنی کہ اس کتاب میں کوئی شک وشبہ والی بات نہیں ہے۔ علم ہندسہ کی بیشتر کتابیں شک وشبہ سے خالی ہوتی ہیں لیکن وہ خدا کے پاس سے اتر کر نہیں آئی ہیں۔

جو تاویل ہم نے اختیار کی ہے وہ زیادہ بہتر طور پر اس سے شک کو دور کر رہی ہے اس لیے کہ وہ خدا کے پاس سے آئی ہے۔ اور پھر چوں کہ وہ کتاب الٰہی ہے اس لیے اس کو ماننا اور اس سے فائدہ حاصل کرنا واجب ہے۔ نیز یہ تاویل موقع کلام کے لحاظ سے بھی احسن ہے کیوں کہ اس میں تعریض کا پہلو ہے، جیسا کہ پچھلی فصل میں گزر چکا ہے۔

هدى للمتقين: اس میں لفظ هدی کا اس کتاب پر اطلاق اس کے جملہ معنوی پہلوؤں کے لحاظ سے ہوا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ایک پہلو کو دوسرے پہلو پر ترجیح دی جائے۔ اب ہم قرآن مجید کی ان صفات کو بیان کرنے جا رہے ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ ان تمام پہلوؤں سے هدی ہے۔ وضاحت کی غرض سے اس کی ہر صفت پر ہم الگ الگ رخ سے نظر ڈالیں گے۔

مطلع اول: هدی کے پہلے معنوی پہلو کے لحاظ سے، جیسا کہ گزر چکا ہے، قرآن مجید نور، بصیرت اور روشنی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ساخت درست کرنے کے بعد جس

طرح اس کے اندر ایک پاکیزہ روح ڈالی جس کی وجہ سے وہ اچھے برے کی پہچان اور سمجھ رکھنے والا اور اوامر و نواہی کا مکلف بنا، جیسا کہ فرمایا ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا. فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا۔ (شمس: ۷۔۸)

﴿شاہد ہے نفس اور جیسا کچھ اس کو سنوارا۔ پس اس کو سمجھ دی اس کی بدی اور نیکی کی۔﴾

اسی طرح اس نے یکے بعد دیگرے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ ایک ''روح'' (وحی) بھیج کر ان کے ذریعہ اس کی دستگیری کی، جیسا کہ فرمایا:

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا۔ (شوریٰ: ۵۲)

﴿اور جس طرح ہم نے تمہاری طرف بھی اپنے امر میں سے ایک روح نازل کی ہے۔ تم نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے بلکہ ہم نے اس کو ایک نور بنایا جس سے ہم ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں۔﴾

یعنی وحی کو روح اور نور بنا کر انبیاء کے قلوب پر نازل کیا اور اس طرح اس سے لوگوں کے دلوں کو زندہ اور روشن کر دیا، جیسا کہ فرمایا ہے:

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا. (انعام: ۱۲۲)

﴿کیا وہ جو مردہ تھا تو ہم نے اس کو زندہ کر دیا اور ہم نے اس کو ایک روشنی بخش دی جسے لے کر وہ لوگوں میں چلتا ہے، اس کے مثل ہو گا جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہے، ان سے نکلنے ہی والا نہیں۔﴾

یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی کتاب کو بہت سی آیتوں میں لوگوں کے لیے ہدایت، نور اور بصیرت اور ضیاء اور حکمت کہا ہے۔ غرض یہ کہ قرآن مجید محض قول نہیں ہے بلکہ وہ ایک نور اور روح ہے جو قلب کی روشنی اور روح کے ساتھ مل کر اس کو مزید روشن اور طاقت ور بنا دیتا ہے، چنانچہ انسان کی فطرت کو اللہ تعالیٰ نے جو نور اور بصیرت عطا کیا ہے اس کے لیے وہ مددگار ثابت ہوتا ہے۔

مطلعِ ثانی: ھدیٰ کے دوسرے معنوی پہلو کے لحاظ سے، جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، قرآن مجید دلیل اور حجت ہے جس سے صحیح رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن جس طرح سعادت

و کامرانی کی راہ دکھاتا ہے اسی طرح وہ خود پر بھی دلالت کرتا ہے اور کسی خارجی دلیل کا محتاج نہیں ہے۔ اس تاویل کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ قرآن مجید کو بینہ، میزان اور فرقان کی صفت سے متصف کیا گیا ہے۔ اور اس کا یہ وصف اس کے پہلے والے وصف سے جداگانہ نوعیت کا نہیں ہے بلکہ اس کا لازمہ ہے کیوں کہ نور، بینہ اور ضیاء اپنے ماسوا کے لیے دلیل راہ ہوتے ہیں اور اس کے محتاج نہیں ہوتے کہ کوئی دوسری چیز ان کے لیے دلیل راہ ہو۔ چنانچہ وہ اپنی دلیل آپ ہیں۔ اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ قرآن مجید کے ہر جملہ کے لیے آیت کا لفظ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی عربی زبان میں کسی چیز کی دلیل اور نشانی کے ہیں خواہ وہ زبان سے پڑھی جانے والی ہو یا نظر سے دکھائی دینے والی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کے اندر دکھائی دینے والی نشانیوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے:

فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَ اللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ، وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ. وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْئًا اتَّخَذَهَا هُزُوًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ مِنْ وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْئًا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ. هٰذَا هُدًى وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ. (جاثیہ: ۶۔۱۱)

﴿تو اللہ اور اس کی آیات کے بعد اور کون سی بات ہے جس پر وہ ایمان لائیں گے، ہلاکی ہے ہر اس لپاڑئے گنہگار کے لیے جو اللہ کی آیتیں سنتا ہے جو اسے سنائی جاتی ہیں پھر اپنی روش پر استکبار کے ساتھ اڑا رہتا ہے گویا اس نے ان کو سنا ہی نہیں تو انہیں ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ اور جب اس کو ہماری آیات میں سے کسی بات کا علم ہوتا ہے تو اس کو مذاق بنا لیتا ہے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے، آگے ان کے جہنم ہے اور جو کچھ انہوں نے کمایا ہے وہ ان کے ذرا بھی کام آنے والا نہیں اور نہ ہی کام آنے والے ہیں وہ جن کو انہوں نے اللہ کے سوا کارساز بنا رکھا ہے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ یہ یکسر ھدیٰ ہے اور جنہوں نے اپنے رب کی آیات کا انکار کیا ان کے لیے ہلا دینے والا دردناک عذاب ہے۔﴾

یہاں دلائل مشہودہ اور وحی متلو کو ان میں غایت درجہ مشابہت کی وجہ سے ایک کر دیا ہے اور انہیں ھدیٰ کا نام دیا ہے۔

مطلع ثالث: قرآن مجید رضاء الٰہی تک پہنچانے کا نہایت سیدھا راستہ ہے۔اس لیے ھدی کے تیسرے معنوی پہلو کے لحاظ سے اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ اسے صراط مستقیم کے معنی میں ہدی کہا جائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْکِتَابَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا قَیِّمًا لِّیُنْذِرَ......(الآیۃ)۔کہف:۱۔۲)

﴿سزاوار شکر ہے اللہ جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری اور اس میں اس نے کوئی کج پیچ نہیں رکھا۔بالکل ہموار اور استوار تا کہ ڈرائے............﴾

یعنی ایسی کتاب جو صراط مستقیم کی طرح سیدھی ہے جس میں کوئی کجی نہیں۔ معلوم ہوا کہ قرآن مجید کا راستہ بالکل سیدھا اور ہموار ہے جس پر چلنے والا کبھی بھٹک نہیں سکتا۔اسی طرح کی بات حضرت نابغہ جعدیؓ نے اپنے اس شعر میں کہی ہے جسے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

اتیت رسول الله اذجاء بالهدى ویتلو کتابا کالمجرة نیرا

(جمہرۃ اشعار العرب:۳:۷۷)

﴿میں اللہ کے رسول کی خدمت میں حاضر ہوا جب آپ ہدایت لے کر تشریف لائے اور ایسی کتاب پڑھ کر سناتے جو کہکشاں کی مانند روشن ہے۔﴾

یعنی یہ کتاب ہدایت جس راستے کی جانب رہنمائی کرتی ہے وہ کہکشاں کی طرح صاف اور روشن راستہ ہے۔ عرب ایسے واضح راستہ کو جس پر چلنے والا کبھی بھٹکتا نہیں کہکشاں سے تشبیہ دیتے ہیں۔ چنانچہ تابط شرا کہتا ہے۔

یرى الوحشة الانس الانیس و یهتدی بحیث اهتدت ام النجوم الشوابک

(دیوان الحماسہ:۹۹)

﴿وہ صحرا کی وحشت کو مونس و ہمدم خیال کرتا ہے اور کہکشاں کی طرح کبھی راستے سے بھٹکتا نہیں۔﴾

چوتھا مطلع رابع: قرآن مجید کو ''ہدیٰ'' کہا گیا ہے جو عربی زبان میں مصدر ہے کیوں کہ اس سے فعل ہدایت کا ظہور درجہ کمال پر ہوا ہے۔چنانچہ ہدیٰ کے چوتھے معنوی پہلو کے لحاظ سے اس کا سزاوار ہوا کہ اللہ تعالیٰ اسے مصدری معنی میں ھدی کا نام دے۔جس طرح اس کو اپنی رحمت اس بنا پر کہا ہے کہ اس سے اس کے فعل رحمت کا ظہور ہوا ہے۔اس بات کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے۔

وَاجْتَبَیْنٰهُمْ وَهَدَیْنٰهُمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ. ذٰلِکَ هُدَی اللّٰهِ یَهْدِیْ بِهٖ

مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ. (انعام:۸۷۔۸۸)

﴿اور ان کو ہم نے برگزیدہ کیا اور انہیں صراط مستقیم کی ہدایت بخشی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے اس سے وہ سرفراز فرماتا ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے۔﴾

یہاں پر ''ذٰلک'' سے فعل 'ھدیناھم' کی طرف اشارہ کیا ہے اور ''هدی الله یهدی به من یشاء من عباده'' سے اس کی خبر دی ہے یعنی یہ ہدایت دینے کا کام درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہدایت بخشی ہے۔ اس کے ذریعہ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔یہی بات ایک اور جگہ فرمائی ہے۔

وَلٰکِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا. (شوریٰ:۵۲)

﴿بلکہ ہم نے اس کو ایک نور بنایا جس سے ہم ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں۔﴾

دوسری جگہ آیا ہے:

قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ کِتٰبٌ مُّبِیْنٌ یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَیُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ یَهْدِیْهِمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ. (مائدہ:۱۵۔۱۶)

﴿اب تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور ایک واضح کتاب آ گئی ہے۔ اس کے ذریعہ سے اللہ ان لوگوں کو جو اس کی خوشنودی کے طالب ہیں سلامتی کی راہیں دکھا رہا ہے اور اپنی توفیق بخشی سے ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لا رہا ہے اور ایک صراط مستقیم کی طرف ان کی رہنمائی کر رہا ہے۔﴾

''یهدی به الله'' اور ''نورا نهدی به'' کا ٹکڑا اس بات پر دلیل ہے کہ قرآن مجید ہی فعل ہدایت کا مظہر اور اس کا منبع و مصدر ہے۔چنانچہ دونوں میں اس گہری وابستگی کی وجہ سے اس کا نام ہی ''ھدی'' رکھ دیا۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے نہایت بلند مرتبت کلام ہے،اس پہلو سے کہ وہ ایک کلمہ خداوندی اور روح غیبی ہے جس نے دلوں کو زندہ کر دیا ہے جیسا کہ مطلع اول میں گزرا۔

مطلع خامس: قرآن مذکورہ تمام پہلوؤں کے اعتبار سے ہدی ہے اور ھدی ان تمام صحیفوں کا بھی نام ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے۔یہاں اللہ تعالیٰ نے اس نام کو قرآن مجید کے لیے جو استعمال کیا ہے تو یہ بتانے کے لیے کیا ہے کہ اس نے انسان سے روز ازل جو وعدہ کیا تھا اسے اس کتاب کو نازل فرما کر پورا کر دیا ہے۔اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ چونکہ احسن الخالقین ہے اور آسمانوں اور

زمینوں کی پوشیدہ چیزوں کو ظاہر اور نمایاں کرنے والا ہے اور ساتھ ہی وہ رب کریم بھی ہے اور نعمتوں کا اہتمام کرنے والا بھی، اس لیے اس نے چاہا کہ انسان کے مرتبہ کو بلند کرے اور اسے اپنی قربت میں جگہ دے، اور دنیا اور اس کے زخارف کی آزمائشوں میں ڈالنے کے بعد اس کے لیے ہدایت کے اسباب فراہم کرے۔ چنانچہ اس نے ان کی طرف ایک کتاب بھیجنے اور اس کے ذریعہ ان کو کمال ہدایت کی طرف بلانے کا فیصلہ کیا، جیسا کہ انہیں دنیا کی طرف روانہ کرتے وقت فرمایا تھا۔

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ. (بقرہ:۳۸)

﴿ہم نے کہا تم سب یہاں سے نیچے اترو تو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔﴾

یعنی تمہارے اندر میں پیغمبروں کو مبعوث کروں گا جو تم کو اللہ کی کتاب پڑھ کر سنائیں گے تو جو اس پر عمل کریں گے وہ فلاح پائیں گے، جیسا کہ دوسری جگہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

يَا بَنِي آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِنْكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي فَمَنِ اتَّقَى وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ. (اعراف:۳۵)

﴿اے اولادِ آدم! اگر تمہارے پاس تمہیں میں سے پیغمبر آئیں جو تم کو میری آیات سنا رہے ہوں تو جس نے خوف کھایا اور اپنی اصلاح کر لی اس کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔﴾

چنانچہ یہاں پر اپنی کتاب کی صفت "ھدی للمتقین" بتا کر اسی وعدہ کی طرف اشارہ کیا ہے یعنی یہ وہی کتاب موعود ہے جو تمہارا تزکیہ کر کے تم کو رب کی خوشنودی کی طرف لوٹائے گی تاکہ وہ نعمت تم کو دائمی طور پر حاصل ہو سکے جو تم نے کھو دی تھی۔

کتاب اللہ کے لیے "ہدیٰ" کا لفظ استعمال ہونے کی صورت میں اس کی جو تاویل ہم نے بیان کی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ لفظ بہت سے اسماء کا جامع ہے۔ مثلاً بصیرت، ضیاء، نور، بینہ، شفاء لما فی الصدور، میزان، فرقان، قیم، صراط مستقیم، روح، امر اور کلمہ۔

۔جاری ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

درس صحیح بخاری

(کتاب المساقاۃ کی روایات)

باب: لاحمیٰ الا للّٰہ و لرسولہ ﷺ.

باب: حمیٰ قائم کرنے کا حق صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو ہے۔

❁ حدثنا یحیی بن بکیر حدثنا اللیث عن یونس عن ابن شہاب عن عبداللہ بن عبداللہ بن عتبة عن ابن عباسؓ ان الصعب بن جثامة قال ان رسول اللہ ﷺ قالَ لَاحِمَى إِلَّا لِلّٰهِ وَلِرَسُولِهِ وقالَ بلغنَا اَنَّ النبیَّ ﷺ حَمَى النقيعَ و اَنَّ عُمَرَ حَمَى السَّرَفَ و الرَّبذة.

ترجمہ:۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ حمی اللہ یا اس کا رسول محفوظ کر سکتا ہے اور امام بخاری کہتے ہیں کہ ہم کو خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نقیع کو محفوظ کیا اور عمرؓ نے سرف اور ربذۃ کو۔

وضاحت:۔ حمی سے مراد Protected Area ہے یعنی محفوظ یا ممنوعہ علاقہ۔ زمانہ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ جہاں گھاس ہوتی یا وادی کی نشیب ہوتی تو بڑے سردار یہ اعلان کر دیتے کہ جہاں تک ہمارے کتوں کے بھونکنے کی آواز پہنچتی ہے ہمارا علاقہ یا ہماری حمی ہے۔ مطلب یہ کہ دوسرا کوئی حصہ دار نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ اسی زمین میں ہو سکتا تھا جو فالتو پڑی ہو اور کسی دوسرے کی ملکیت نہ ہو۔ آنحضرت ﷺ نے یہ حکم دے دیا کہ یہ زمین سٹیٹ کی ملکیت ہے، اسٹیٹ کے سوا کوئی اور حمی نہیں بنا سکتا۔ صدقہ کے جانور وغیرہ جو ملتے تھے تو ان کے چرنے کے لیے علاقہ محفوظ کر دیا جاتا تھا اور کوئی دوسرا بغیر اجازت اس کو استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ باقی اگر کوئی چراگاہ بنانا چاہتا تو اپنی زمین میں بنا سکتا تھا۔ یہ پابندی بہت اہم تھی۔ اس کے بعد اراضی کی اصلاح کے سلسلہ میں اسٹیٹ کے سوا کسی کو اختیار نہیں رہا۔ آج بھی بہت ساری سرکاری زمینوں پر لوگوں نے قبضہ کیا ہوا ہے لیکن افسوس کہ ان کے پیٹ سے کوئی نکال نہیں سکتا۔ اس روایت کی رو سے آنحضرت ﷺ نے نقیع کو حمی بنایا اور حضرت عمرؓ نے سرف اور ربذۃ کو۔ دوسری روایتوں میں آتا ہے کہ دیگر خلفاء نے بھی حمی قائم کیں۔

باب: شُرب الناس والدوآب مِن الانہارِ

باب: نہروں سے لوگوں اور جانوروں کا پانی پینا

❁ حدثنا عبداللہ بن یوسف اخبرنا مالک بن انس عن زید بن اسلم عن ابی صالح السمان عن ابی ہریرۃؓ اَنَّ رسولَ اللہِ ﷺ قالَ الخَیلُ لِرَجلٍ اَجر" ولِرجُلٍ سِتر" و علی رجلٍ وزر" فَامّا الَّذِی لہ' اَجر" فَرجُل" رَبَطَھا فِی سَبِیلِ اللّٰہِ فَاَطَالَ بِھا فی مرجٍ او روضۃٍ فَمَا اَصَابَت فِی طِیلِھَا ذَالکَ مِن المرجِ اوالرَّوضَۃ کانَتْ لہ' حسنات ولو اَنَّہٗ انقَطِعَ طِیلُھَا فاستنَّتْ شرَفًا اَو شرفَینِ کانَتْ اٰثارُھا وَاَرواثُھا حَسَنَاتٍ لہ' ولَو اَنَّھا مَرَّتْ بِنَھرٍ فَشَرِبت مِنہُ وَلَم یُرِدْ اَن یَسقِیَ کان ذالکَ حسناتٍ لہ' فَھِی لِذالکَ اجر" ورَجل" ربطھا تغنیاً و تعفُّفًا ثُم لَم یَنسَ حقَّ اللہِ فی رِقَابِھا ولا ظُھُورِھَا فھی لذالکَ ستر" ورجل" رَبَطھا فخرًا ورِیَاءً و نِواءً لِاھلِ الاسْلَامِ فھِی علی ذالک وِزر" وسُئِلَ رسولُ اللہ ﷺ عَنِ الحُمرِ فقَال ما اُنزِل علیَّ فِیھا شیء" الاھذہ الاٰیۃ الجامعۃ الفاذۃ فمن یعمل مِثقالَ ذرۃٍ خیرًا یرہ' ومَن یعمل مِثقالَ ذرَّۃٍ شرًا یرہ'.

ترجمہ:۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ گھوڑا کسی کے لیے اجر بنتا ہے، کسی کے لیے پردہ بنتا ہے اور کسی کے اوپر بار بنتا ہے۔ جس کے لیے اجر ہے تو وہ شخص ہے جو گھوڑے کو اللہ کی راہ میں کام کے لیے رکھے اور اس کی رسی باغ میں یا چراگاہ میں دراز کر دے تو جتنا کچھ بھی رسی کے دائرہ میں چرے گا، باغ میں یا چراگاہ میں تو وہ مالک کے لیے خیر بنے گا اور اگر اس کی رسی ٹوٹ جائے اور وہ ایک یا دو بلندی تک دوڑ پائے تو گھوڑے کے نشانات اور لید مالک کے لیے خیر بنے گی اور اگر وہ کسی نہر پر گزرے اور اس میں سے پانی پی لے درآں حالیکہ مالک نے چاہا بھی نہ ہو کہ اس کو پلائے تو وہ بھی مالک کے لیے اجر بنے گا۔ اور وہ شخص جس نے خود حفاظتی اور خود کفالتی کے لیے گھوڑا پالا ہے اور پھر وہ اللہ کا حق نہیں بھولا، نہ اس کی گردن میں نہ اس کی پیٹھ میں، تو وہ اس کے لیے ستر بنے گا۔ اور وہ شخص جس نے گھوڑا رکھا اترانے اور دکھانے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے تو وہ اس کے لیے وبال اور عذاب ہے اور آنحضرت ﷺ سے گدھوں کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ گدھوں کے باب میں مجھ پر کچھ نہیں اترا مگر یہ جامع آیت کہ جو کوئی رتی برابر بھلائی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا اور جو کوئی رتی برابر برائی کرے گا وہ بھی اس کو دیکھ لے گا۔

وضاحت:۔ یہ روایت اپنی جگہ پر بہت اچھی اور برکات و انوار سے مملو ہے۔ اس میں گھوڑا پالنے والوں کی تین قسمیں بتائی گئی ہیں۔ پہلے شخص نے جہاد کے لیے گھوڑا پالا۔ اصابت فی طیلھا میں طیل سے مراد ہے اس کی رسی کا دائرہ جہاں تک گھوڑا چر سکتا ہے، چراگاہ یا باغ میں جہاں تک گھوڑا اس دائرے کے اندر جائے گا وہ سب مالک کے لیے خیر بنے گا۔ اور اگر اس کی رسی منقطع ہو جائے اور وہ ایک دو دوڑیں بھی لگا لے تو اس کے نقش قدم اور اس کی لید سب مالک کے لیے حسنات بنیں گے اور اگر وہ کسی نہر پر پانی پی لے اگرچہ مالک نے نہ بھی چاہا ہو تب بھی مالک کے لیے اجر بنے گا۔ تو جس شخص نے اللہ کی راہ میں گھوڑا پالا تو یہ سب چیزیں اس کے لیے اجر بنیں گی۔

دوسرا وہ شخص ہے جس نے گھوڑا رکھا تغنیا اور تعففا اور اس کا حق گردن میں اور اس کی پیٹھ میں نہیں بھولا تو وہ گھوڑا بھی اس شخص کے لیے نجات بنے گا۔ میرے نزدیک تغنیا کے معنی خود حفاظتی اور تعففا کے معنی خود کفالتی کے ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ شخص نہیں چاہتا کہ دوسروں کا محتاج رہے۔ گھوڑا رکھا ہے ضرورت پڑی تو دوڑ لگا کر کچھ شکار کر لیا، اگر دشمن آیا تو سوار ہو کر مقابلہ کے لیے تیار ہو گیا۔ اور اس کا حق گردن میں اور پیٹھ میں نہیں بھولا۔ پیٹھ کا حق تو یہ ہے کہ محتاج کو سوار کرا دے یا مدد کر دے لیکن گردن کے حق کا مفہوم واضح نہیں ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس سے مراد زکوۃ ہے۔ لیکن اس کے ماننے میں مشکل یہ ہے کہ سر گھوڑے میں زکوۃ سوائے احناف کے کوئی اور شاید ہی مانتا ہو۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ایسا گھوڑا اس شخص کے لیے ستر بنے گا یعنی بچاؤ یا محافظ۔ اس زمانہ میں گھوڑے کی یہ اہمیت تھی کہ گھر میں اگر گھوڑا بندھا ہے تو ایسا تھا گویا حفاظت کے لیے ٹینک کھڑا ہے۔ اس زمانے میں گھوڑے کی قدر و قیمت کم ہو گئی ہے۔ اس لیے اب جو چیزیں اس کی قائم مقام ہوں گی ان سے بھی اسی اجر کی توقع ہے۔

تیسرا آدمی اپنے تکبر کے اظہار اور لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے گھوڑا پالتا ہے تو ظاہر ہے یہ صفات اللہ کو ناپسند ہیں۔ اس لیے گھوڑا پالنا اس شخص کے لیے وبال بنے گا۔

لوگوں نے جب گدھوں کے بارے میں پوچھا تو حضور نے ایک اصول کی نشاندہی کے لیے سورہ زلزال کی آخری آیت کا حوالہ دے دیا۔ اس میں فرمایا ہے کہ ذرہ برابر نیکی یا بدی جو کسی انسان نے کی ہوگی وہ اللہ کے ہاں موجود ہوگی اور اس کے اثرات بھی ظاہر ہوں گے۔

اس روایت میں ایسی کیا چیز ہے جس کی بناء پر امام صاحب نے "نہر سے لوگوں اور جانوروں کے پانی پینے" کا باب باندھ کر اس کو اہمیت دی ہے، یہ چیز میری سمجھ میں نہیں آئی۔

❁ حدثنا اسمٰعیل حدثنا مالک عن ربیعۃ بن ابی عبدالرحمن عن یزید مولی

المنبعث عن زید بن خالدؓ قال جاء رجل الی رسول الله ﷺ فسالہٗ عن اللُّقطۃِ فقال اَعرف عِفاصھَا وِ وِکائَھا ثم عَرِّفھا سنۃ فان جَاءَ صاحِبُھا و اِلّا فَشانکَ بِھا قال فضالّۃُ الغنمِ قال ھی لکَ اَولا خِیکَ اَو لِلذِّئبِ قال فضالّۃُ الابلِ قال مالکَ ولَھا مَعھَا سِقَاؤُھا و حِذاؤُھا ترِدالماءَ و تَاکلُ الشجرَ حتی یلقھا ربُّھا.

ترجمہ:۔ زید بن خالدؓ راوی ہیں کہ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے گری پڑی چیز کے بارے میں پوچھنے لگا۔ آپ نے فرمایا کہ اس کی تھیلی اور بندھن کو اچھی طرح پہچان لو اور پھر ایک سال تک تعارف کراؤ۔ اگر اس کا مالک آ جائے تو خیر ورنہ تم اس سے جو چاہو کرو۔ اس نے سوال کیا: اگر بھولی بھٹکی بکری ملے تو۔ آپ نے فرمایا یا تو تم اس سے فائدہ اٹھاؤ گے یا تمہارے بھائی کا حصہ بنے گی یا پھر بھیڑیے کا۔ اس نے پوچھا: بھولا بھٹکا اونٹ ہو تب!؟ تو آپ نے فرمایا اونٹ سے تمھیں کیا سروکار، اس کا مشکیزہ اور موزہ سب اس کے ساتھ ہے۔ پانی پی لے گا، درخت کے پتے کھالے گا یہاں تک کہ اس کا مالک اس کو پالے گا۔

وضاحت:۔ اس روایت میں لقطہ یعنی گری پڑی چیز کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں۔ بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اس چیز کو پانے والا اس کی تھیلی اور اس کے بندھن کو اچھی طرح پہچان لے تاکہ کوئی شخص آئے اور مطالبہ کرے تو اس سے پوچھ سکے کہ اپنی گمشدہ چیز کا اتا پتہ دے دو کہ وہ کیسی ہے، اس کا کیا رنگ ہے وغیرہ۔ اگر وہ کچھ صحیح نشانیاں بیان کرتا ہے تو معاملہ کو آگے بڑھائیں گے، ورنہ کہہ دیں گے کہ یہ چیز آپ کی نہیں ہے۔ گم شدہ چیز کا ایک سال تک اعلان کرنے کا حکم ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ جمعہ کے جمعہ مسجد میں اعلان کر دیا جائے۔ سال گزرنے کے بعد بھی اگر مالک نہ ملے تو پانے والا جس مصرف میں اس کو لانا چاہے لا سکتا ہے۔ رہ گئی بکری تو اس کو آوارہ نہیں پھرنے دینا چاہیے۔ اگر آپ اس سے فائدہ نہیں اٹھاؤ گے تو بھیڑیے کا لقمہ بن جائے گی۔ باقی رہ گیا کہ ایک سال تک بکری کا تعارف کرایا جائے تو یہ کام بہت مشکل ہے۔ اس زمانے میں اخبار میں اشتہار دیا جا سکتا ہے، غالباً آوارہ جانوروں کے لیے مویشی خانے بھی بن گئے ہیں اور تلاش کرنے والے وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ مویشی خانہ والے جتنے دن چارہ، پانی دیں گے اس کا کچھ معاوضہ وصول کر لیں گے۔ باقی رہ گیا اونٹ کا معاملہ تو نبی ﷺ نے فرمایا اللہ کے بندو تمھیں اس کی فکر نہیں ہونی چاہیے۔ وہ اپنا مشکیزہ اور موزہ سب کچھ اپنے ساتھ لیے پھرتا ہے۔ اس کو کسی کا کوئی ڈر بھی نہیں ہے۔ وہ کھا پی کر اپنا گزارہ کر لے گا اور مالک اس کو تلاش کر لے گا۔ اس صورت میں ان لوگوں کا مسئلہ قابل غور ہے جن کی فصلیں ہوتی ہیں اس لیے کہ ایک آوارہ اونٹ نہ جانے

کتنے کھیت ختم کر سکتا ہے۔ تو میرے نزدیک اس کا علاج بھی یہی ہے کہ اونٹ کو مویشی خانے میں بھجوا دیا جائے۔

باب: بیع الحطب والکلا

باب: لکڑی اور گھاس کی فروخت

❁ حدثنا معلی بن اسد حدثنا وھیب عن ھشام عن ابیہ عن الزبیر بن العوام عن النبی ﷺ قال لَاَنْ یاخذَ احدُکم اَحبُلاً فیاخذَ حزمۃً من حطبٍ فیبیعَ فیکُفَّ اللہ بہ وجھَہٗ خیر" من اَن یَّسْاَلَ الناسَ اُعطِیَ اَمْ مُنِع.

ترجمہ:۔ زبیر بن العوامؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص رسی اٹھالے اور لکڑیوں کا گٹھا بنائے، پھر اس کو بیچے تاکہ اللہ تعالیٰ اس طرح اس کی عزت کو بچالے تو یہ بہتر ہے اس بات سے کہ لوگوں کے آگے سوال کرتا پھرے، کوئی اسے دے دے گا اور کوئی نہیں دے گا۔

❁ حدثنا یحییٰ بن بکیر حدثنا اللیث عن عقیل عن ابن شھاب عن ابی عبید مولیٰ عبدالرحمن بن عوف انہ سمع اباھریرۃؓ یقول قال رسول اللہ ﷺ لَاَن یَحتَطِبَ احدُکم حزمۃً علیٰ ظھرِہٖ خیر" لہٗ من اَنْ یَسْاَلَ احدا فیُعطِیَہٗ او یَمنَعَہٗ.

ترجمہ:۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ بات، کہ تم میں سے کوئی شخص لکڑی کا ایک گٹھا اپنی کمر پر لاد کر لائے اور اس کو ایندھن کے طور پر بیچے، بہتر ہے اس بات سے کہ دوسروں سے سوال کرے، کوئی اس کو دے یا نہ دے۔

وضاحت:۔ ان حدیثوں کی تعلیم یہ ہے کہ آدمی کے لیے اپنی خودداری اور وقار کا تحفظ بہت ضروری ہے۔ جس طرح سے بن آئے آدمی اپنے ہاتھ کی کمائی کھائے تو یہ بہتر ہے اس بات سے کہ دوسروں کے آگے سوال کرتا پھرے۔ لکڑی کا گٹھا بنا کر بیچنا مثال کے طور پر بیان کیا ہے۔ اپنے ہاتھ کی کمائی کے لیے کوئی بھی کام، خواہ کتنا ہی حقیر کیوں نہ نظر آئے، کرے تاکہ اپنے پیٹ کی آگ بجھائے۔ آدمی دوسرے کے آگے سوال سے اپنی ناموس کو بچالے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے رزق کی راہ کھول دیتا ہے۔

یہ بات یاد رکھیے کہ دست سوال دراز کرنے جیسے دنیاوی حیلے بہانوں سے زیادہ برے دینی بہانے ہیں۔ جو دین فروشی کرنے کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ خواہ مخواہ کو دین کے نام پر

دھونگ رچایا جاتا ہے۔اس سے بچنا چاہیے۔ جو کوئی اپنے ایمان کو محفوظ رکھنا چاہے گا اللہ تعالیٰ کی طرف سے گارنٹی ہے کہ اس کے لیے راہیں کھولی جائیں گی۔ یہ قرآن سے بھی ثابت ہے اور حدیث سے بھی واضح ہے۔

❁ حدثنا ابراهیم بن موسیٰ اخبرنا هشام ان ابن جریج اخبرهم قال اخبرنی ابن شهاب عن علی بن حسین بن علی ابیه حسین بن علی عن علی بن ابی طالب انه قال اَصَبتُ شارفاً مع رسولِ الله ﷺ فی مغنم یوم بدرٍ قال و اعطانی رسول الله ﷺ شارفا اخریٰ فَاَنختُهما یومًا عند بابِ رجلٍ من الانصارِ و انا اُرِیدُ ان اَحمِلَ عَلَیها اِذخراً لاَبِیعَه' و معِیَ صائغ" مِن بَنِی قَینقاعَ فَاستَعِینَ به علیٰ ولیمة فاطمة و حمزةُ بنُ عبدالمطلبِ یَشربُ فِی ذالکَ البیتِ معَه' قَینة فقالت الا یاحمزَ لِلشُّرفِ النواء، فثار الیهما حمزةُ بِالسَّیفِ فَجَبَّ اَسنمتُهما و بقَرَ خَواصِرَ هما ثم اخذ من اکبادهما قُلتُ لِابنِ شهابٍ و مِنَ السَّنام قال قد جبَّ اسنمتها فذهب بها قال ابنُ شهابٍ قال علیٌّ" فَنظرتُ اِلیٰ مَنظرٍ اَفظعنی فاتیتُ نبیَّ الله ﷺ و عنده' زیدُ بن حارثةَ فاخبرتُه' الخبرَ فَخَرجَ و مَعه' زید" فانطلقت مَعه' فدخلَ علیٰ حمزةَ فَتَغَیَّظَ عَلَیهِ فرفع حمزةُ بصره' و قالَ هَل انتُم الا عبید لِاٰبائی فرجعَ رسولُ اللهِ ﷺ یُقَهقِرُ حتیٰ خرَجَ عنهم وَ ذٰلکَ قبلَ تحریمِ الخمرِ۔

ترجمہ:۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ بدر کے مالِ غنیمت میں سے مجھے ایک جوان اونٹنی ملی تھی اور ایک اونٹنی مجھے آنحضرت ﷺ نے دی تھی۔ میں نے دونوں اونٹنیوں کو ایک انصاری شخص کے دروازے پر بٹھایا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں ان پر اذخر لاد کر لاؤں اور اس کو بیچوں۔ میرے ساتھ بنی قینقاع کا ایک سنار بھی تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس کی مدد حاصل کروں اور اذخر بیچ کر حضرت فاطمہؓ کے ساتھ شادی کا ولیمہ کروں۔ اس وقت حمزہ بن عبدالمطلب اس گھر میں مےنوشی کر رہے تھے اور ساتھ گانے والی ایک عورت بھی تھی۔ اس نے یہ مصرعہ گایا کہ اے حمزہ اٹھو فربہ جوان اونٹنیوں کے لیے، تو حمزہ تلوار لے کر اٹھے اور اونٹنیوں کے کوہان کاٹ ڈالے اور ان کے پیٹ پھاڑ ڈالے اور کلیجیاں نکال لیں۔ ابن جریج نے ابن شہاب سے پوچھا کہ کوہانوں میں سے کیا لیا، تو انہوں نے کہا کہ کوہان تو وہ کاٹ کر لے گئے۔ ابن شہاب کہتے ہیں، حضرت علیؓ نے کہا میں نے اس منظر کو دیکھا تو مجھے بڑی وحشت ہوئی اور میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کے پاس زید بن حارثہ بھی تھے۔ تمام روداد سنائی تو نبی ﷺ نکلے۔ ان کے ساتھ زید بھی تھے۔ میں بھی آپ کے ساتھ ہولیا۔ آپ حمزہ کے پاس گئے تو ان پر غصہ کا اظہار کیا۔ حمزہ نے سر اٹھایا اور کہا تم ہو کیا؟ میرے باپ دادا کے غلام! یہ حالت دیکھ کر رسول اللہ ﷺ

الٹے پاؤں وہاں سے تشریف لے گئے۔ یہ واقعہ تحریم خمر سے پہلے کا ہے۔

وضاحت:۔ اذخر ایک خاص قسم کی خوشبودار گھاس تھی۔ دوسرے مصارف کے علاوہ سنار بھی اس سے کام لیتے تھے۔ حضرت علیؓ کا ارادہ تھا کہ دو اونٹنیوں پر گھاس لاد کر لاؤں گا اور اس کو سنار کے پاس بیچ کر اپنی شادی کا ولیمہ کر دوں گا۔ انہوں نے اونٹنیاں ایک دروازے پر بٹھائیں۔ اس گھر میں اس وقت حضرت حمزہؓ مےنوشی میں مصروف تھے اور جیسا کہ وضاحت ہے اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی۔ شراب کے نشے میں یہ واقعہ ہو گیا کہ انہوں نے اونٹنیاں ذبح کر ڈالیں اور ان کی کلیجیاں نکال لیں۔ شراب ہے ہی ایسی چیز کہ آدمی اس کے نشے میں عقل سے عاری ہو جاتا ہے۔ حضرت علیؓ نے آنحضرت ﷺ سے اس کی شکایت کی۔ آپ موقع پر تشریف لے گئے اور حمزہ پر غصہ کا اظہار بھی کیا کہ یہ تم نے کیا کر ڈالا۔ حمزہ نشہ میں تو تھے ہی، انہوں نے کہہ دیا کہ تم میرے باپ دادا کے غلام ہی تو ہو۔ آنحضرت ﷺ نے جب یہ دیکھا کہ نشے میں ان کی یہ حالت ہو رہی ہے تو چپ چاپ لوٹ آئے۔ یہ بھی بہت اچھی تعلیم ہے کہ ایسے وقت میں کچھ کرنا اپنی ہی فضیحت کروانا ہوتا ہے۔ لہٰذا موقع کو ٹال دینا چاہیے۔

اتنی اہم اور تاریخی روایت سے امام صاحب نے بس یہ بات ثابت کی ہے کہ گھاس پھوس کو فروخت کرنا جائز ہے۔

باب: القطائع

باب: جاگیر کے بارے میں

❁ حدثنا سلیمان بن حرب حدثنا حماد بن یحییٰ بن سعید قال سمعت انساً قال اراد النبی ﷺ اَن یقطعَ مِن البحرَینِ فقالَتِ الانصارُ حتیٰ تَقطعَ لِاِخوانِنا من المهاجِرینَ مثلَ الَّذی تقطعُ لنَا قال سترونَ بَعدی اثرةً فَاصبِرُوا حتّٰی تلقونی۔

ترجمہ:۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ بحرین کے علاقہ میں کچھ جاگیریں (انصار کو) دے دیں۔ انصار نے مشورہ دیا کہ حضور! آپ اس وقت تک ایسا نہ کریں جب تک کہ آپ ہمارے مہاجر بھائیوں کو بھی ایسی ہی جاگیر نہ دے دیں۔ آپ نے فرمایا میرے بعد تم عنقریب دیکھو گے کہ دوسرے لوگ تم پر مقدم رکھے گئے تو مجھ سے ملنے تک صبر کیے رہنا۔

وضاحت:۔ کسی کو اس کی خدمات کی بنا پر جاگیر حکومت کی طرف سے دی جاتی ہے۔ یہ ہر زمانے میں

ہوتا رہا ہے۔ آج کل ہمارے ہاں اس کا جتنا زور ہے اس کی مثال تاریخوں میں ملنی مشکل ہے۔ بہترین زمینیں اور پلاٹ تقسیم ہو رہے ہیں اور اسی پر ملک کی ساری سیاست کا دارومدار ہے۔ لیکن دیکھیے کیا جذبات تھے اس زمانے میں! انصار نے کہا کہ حضور! یہ آپ اس وقت تک نہ کریں جب تک کہ ہمارے مہاجر بھائیوں کو بھی ایسی ہی جاگیر نہ دے دیں۔ سبحان اللہ! انصار کا وہ جذبہ جو مہاجرین کے خیر مقدم میں ظاہر ہوا تھا کیا کم تھا کہ بعد کی فتوحات کے دور میں بھی انہوں نے مہاجرین کا خیال رکھا۔ روایت سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ انصار کے اس جذبہ سے بہت متاثر ہوئے اور فرمایا آج تو تم دوسروں کو اپنے پر ترجیح دے رہے ہو لیکن ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ دوسروں پر اپنے کو ترجیح دیں گے۔ ایسا زمانہ آئے تو تم اس رنگ میں نہ رنگ جانا بلکہ صبر کرنا۔ حوض کوثر پر مجھ سے ملو گے تو شاد ہو جاؤ گے۔

باب: كتابة القطائع

و قال الليث عن يحيى بن سعيد عن انسؓ دعا النبي ﷺ الانصارَ يُقطِعَ لهم بالبحرين فقالوا يا رسولَ الله ﷺ إن فعلتَ فاكتُبْ لإخواننا من قريش بمثلها فلم يكن ذالك عند النبي ﷺ فقالَ انكم سترونَ بعدي اَثَرةً فاصبِرُوا حتى تلقوني.

باب: جاگیر، مقطعوں کی سند لکھ دینے کے بارے میں،

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے انصار کو بلایا کہ بحرین میں ان کو جاگیریں دیں۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر آپ دیتے ہیں تو ہمارے بھائی قریش کو بھی ویسی ہی جاگیروں کی سند لکھ دیجیے لیکن آپ کے پاس ایسے حالات نہیں تھے۔ آپؐ نے فرمایا تم میرے بعد دیکھو گے کہ دوسرے لوگ تم پر مقدم رکھے گئے تو تم مجھ سے ملنے تک صبر کیے رہنا۔

وضاحت: ۔ یہ وہی روایت ہے لیکن دو ٹکڑے اس میں زیادہ ہیں۔ ایک یہ کہ آپ نے اپنے حکم نامہ کو تحریر کرنا چاہا۔ یہ اس لیے کہ ریکارڈ رہے۔ دوسرے یہ کہ آنحضرت ﷺ کے پاس انصار کی خواہش پوری کرنے کا امکان نہیں تھا۔ اس لیے کہ غالباً زمین زیادہ نہیں رہی ہوگی۔ حدیث سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بحرین کی زمینوں کی حیثیت کیا تھی؟ وہاں کے باشندے ذمی قرار پائے تھے یا بحرین مفتوح علاقہ قرار پایا تھا، یہ سب معاملات مبہم ہیں۔

باب: حلبِ الابلِ علَى الْمَاءِ

باب: اس بارے میں کہ اونٹوں کو چشموں پر ہی دوہا جائے

❁ حدثنا ابراهيم بن المنذر حدثنا محمد بن فليح قال حدثني ابي عن هلال بن علي عن عبدالرحمن بن ابي عمرة عن ابي هريرةؓ عن النبي ﷺ قال من حقِّ الابلِ ان تحلبَ علَى المَاءِ.

ترجمہ: ۔ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ اونٹوں کا حق یہ ہے کہ ان کا دودھ چشموں ہی کے اوپر دوہا جائے۔

وضاحت: ۔ یہ اسی طرح کا حکم ہے جیسا کہ اس بات کی ممانعت کی گئی کہ رات کو فصل نہ کاٹی جائے یا رات کو باغ کا پھل نہ توڑا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لئیم اور کنجوس قسم کے لوگ نہیں چاہتے تھے کہ غریب اس میں سے حصہ پا جائیں فرمایا کہ اونٹوں کو دوہنا ہے تو گھر میں بند کر کے نہ دوہا جائے بلکہ چشمہ پر سبیل لگائی جائے تا کہ غریب لوگ جمع ہو جائیں تو ان کو بھی کچھ مل جائے۔ ظاہر ہے کہ چشمہ ایک پبلک جگہ ہوتی ہے۔ اس سے ایک نتیجہ اور بھی نکلتا ہے وہ یہ کہ جن اموال کی زکوٰۃ مقرر کی جا سکتی ہے ان کا قاعدہ معلوم ہے۔ جو اموال اس قاعدہ کی زد میں نہیں آتے ان کی زکوٰۃ یہ ہے کہ وقت کے اوپر جو غریب آ جائے حسب توفیق اس کو کچھ دے دیجیے۔ یہاں ان کو دودھ دے دینا آپ کے اونٹوں کی زکوٰۃ ہوگی۔

گویا ایک تو وہ زکوٰۃ ہوگی جو حکومت کا محصل آ کر وصول کرے گا۔ دوسری وہ زکوٰۃ ہوگی کہ جو بر سر موقع غریبوں کو رواج کے مطابق دے دیں گے۔ غلے وغیرہ کی باقاعدہ زکوٰۃ نکالی جائے گی لیکن اگر کھیت کٹ رہا ہے یا پھل توڑے جا رہے ہیں اور کچھ غریب لوگ آ گئے تو اس وقت ان کو کچھ نہ کچھ دے دیا جائے گا اور یہ باقاعدہ زکوٰۃ کے علاوہ ہے۔ ہمارے دیار میں اس کا رواج تھا، اس کو فروغ دیا جانا چاہیے۔

باب: الرجلُ يكونُ له ممَرٌ او شربٌ في حائطٍ اَوفي نخلٍ.

قال النبي ﷺ من باعَ نخلًا بعدَ ان تُوبَّر فثمَرتُها للبائعِ فللبائعِ المَمَرُّ والسَّقيُ حتى يَرفعَ و كذالك ربُّ العَرِيَّة.

باب: اس شخص کے بارے میں جس کو باغ میں سے گزرنے یا پانی دینے یا کھجور کا پھل لینے کا حق حاصل ہو۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس نے کوئی نخلستان تابیر کے بعد بیچا تو اس کا پھل بائع کا ہوگا اور بائع کو باغ میں سے گزرنے کا اور پانی دینے کا حق حاصل ہے۔

اور اسی طریقہ سے عریہ کے مالک کا معاملہ بھی ہے۔

وضاحت:۔ تابیر کے معنی کھجور کے مادہ درخت کو گابھا لگانا ہے۔ عریہ کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے باغ کا پھل بیچ دیا لیکن اپنے استعمال کے لیے کچھ درخت سودے سے مستثنیٰ کر لیے۔

❁ اخبرنا عبداللہ بن یوسف حدثنی اللیث و حدثنی ابن شہاب عن سالم بن عبداللہ عن ابیہ قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول من ابتاع نخلاً بعد ان تؤبر فثمرتھا للبائع الا ان یشترط المبتاع و من ابتاع عبدًا ولہٗ مال" فمالہ للذی باعہٗ الا ان یَشترِطَ المُبتاعُ و عن مالک عن نافع عن ابن عمرؓ عن عمرؓ فی العبد۔

ترجمہ:۔ عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ سے سنا کہ جس نے کوئی نخلستان خریدا بعد اس کے کہ اس کو گابھا لگایا جا چکا تو اس کا پھل بیچنے والے کا ہوگا الا آنکہ خریدنے والے نے شرط لگا دی ہو۔ اور جس نے کوئی غلام خریدا اور اس کا کچھ مال بھی ہے تو مال اس شخص کا ہوگا جس نے اس کو بیچا الا آنکہ خریدنے والے نے شرط لگا دی ہو۔

وضاحت:۔ یعنی عام قاعدہ تو یہی ہوگا کہ جس شخص نے گابھا لگایا اور باغ اس کے بعد بیچ دیا تو وہ پھل کا حق دار ہوگا۔ خریدار کو پھل اگلے سال ملے گا لیکن اگر خریدنے والے نے شرط لگا دی ہے تو معاملہ شرط کی بنیاد پر ہوگا۔ رہ گیا غلام تو وہ کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا۔ اگر اس کے پاس مال ہے تو وہ سابق مالک کا ہے۔ ہاں اگر شرط یہ ہے کہ غلام کا مال نئے مالک کو ملے گا تو شرط کے مطابق معاملہ ہوگا۔

❁ حدثنا محمد بن یوسف حدثنا سفیان عن یحیٰی بن سعید عن نافع عن ابن عمرؓ عن زید بن ثابتؓ قال رخص النبی ﷺ ان تباعَ العرایا بِخرصِھا تمرًا۔

ترجمہ:۔ حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اس بات کی اجازت دی کہ عرایا کی بیع تخمینہ کر کے خشک کھجور کے عوض ہو سکتی ہے۔

وضاحت:۔ مطلب یہ کہ باغ کے کچھ درختوں کے تازہ پھل کے آپ خریدار بن سکتے ہیں اس شرط پر کہ درخت پر پھل کا تخمینہ لگایا جائے اور اس کے بدلے خشک کھجور کی متعین مقدار دے دی جائے۔ عام حالات میں یہ بیع جائز نہیں ہے لیکن ضرورت کے لیے ایک خاص دائرہ میں خاص حد تک جائز کر دی گئی ہے۔ عام حالات میں اس کے ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ کچی اور پکی فصل میں غرر اور ضرر کا اندیشہ ہے۔ مجبوروں میں عرایا کی صورت میں پانچ وسق تک کی مقدار جائز قرار دی گئی ہے۔ یہ بحثیں کتاب البیوع میں گزر چکی ہیں۔

❁ حدثنا عبداللہ بن محمد حدثنا ابن عیینۃ عن جریج عن عطاء سمع جابر بن عبداللہ نھی النبی ﷺ عن المخابرۃ والمحاقلۃ و عن المزابنۃ و بیع الثمر حتی یبدو صلاحھا و ان لا تباع الا بالدینار والدراھم الا العرایا۔

ترجمہ:۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے مخابرۃ، محاقلۃ اور مزابنہ سے نیز میوہ کے بیچنے سے، جب تک کہ اس کی پختگی نہ ظاہر ہوئی ہو منع فرمایا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ درخت پر لگا ہوا پھل نہ بیچا جائے مگر روپیہ یا اشرفی کے بدل میں۔ البتہ عرایا میں آپ نے پھل کے عوض بیچنے کی اجازت دی۔

❁ حدثنا یحیٰی بن قزعۃ اخبرنا مالک عن داؤد بن حصین عن ابی سفیان مولیٰ ابی احمد عن ابی ہریرۃؓ قال رخص النبی ﷺ فی بیع العرایا بخرصھا مِنَ التمر فیما دُون خمسۃ اوسقٍ او فی خمسۃٍ شک داؤد فی ذالک۔

ترجمہ:۔ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے عرایا کی بیع کی اجازت دی اتنے ہی کھجور کے بدل درخت پر اندازہ لگا کر جبکہ مقدار پانچ وسق سے کم یا پانچ وسق ہو۔

❁ حدثنا زکریا بن یحیی اخبرنا ابو اسامۃ قال اخبرنی الولید بن کثیر قال اخبرنی بشیر بن یسار مولیٰ بنی حارثۃ ان رافع بن خدیج و سھل بن ابی حثمۃ حدثاہ انّ رسولَ اللہ ﷺ نھی عن المزابنۃ بیع الثمرِ والتمرِ الا اَصحابَ العَرایا فانہٗ اذِنَ لھُم قال ابو عبداللہ و قال ابن اسحاق حدثنی بشیر مثلہ۔

ترجمہ:۔ رافع بن خدیج اور سہل بن ابی حثمہ دونوں نے بیان کیا کہ آنحضرت ﷺ نے مزابنہ سے یعنی درخت پر کی کھجور خشک کھجور کے بدل بیچنے سے منع فرمایا البتہ عرایا والوں کو اس کی اجازت دی۔

وضاحت:۔ ان احادیث کے مضمون پر بحثیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ ان کو وہاں ملاحظہ کیا جائے۔

باب فی الاستقراض و اداء الدیُونِ والحجرِ والتفلیسِ

باب: قرض لینے، قرضوں کی ادائیگی، حق استعمال ملکیت روک دینے اور دیوالیہ پن کے بارے میں

وضاحت:۔ حجر کے معنی یہ ہیں کہ کسی ملکیت سے اس کے مالک کو قانون کے تحت روک دیا جائے اور تفلیس کے معنی ہیں کہ قانونی طور پر آپ کسی کو دیوالیہ مان لیں۔

باب: من اشتریٰ بالدّینِ و لیسَ عندہ' ثمنہ' اَولیسَ بِحضرَتِہ.

باب: اس بارے میں کہ کسی شخص نے کوئی چیز قرض خریدی درآنحالیکہ اس کی قیمت نہ اس کے پاس نقد موجود ہے اور نہ غائب میں موجود ہے۔

وضاحت:۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کے پاس پیسے نہیں اور اس کے بغیر ہی آپ نے کوئی چیز خرید لی۔ یہ ہوتا رہتا ہے کہ آپ کے پاس پیسہ نہیں ہوتا، دوکان پر جیب خالی ہوتی ہے اور آپ خریداری کرتے ہیں۔ تنخواہ ملتی ہے تو چند دن میں ختم ہو جاتی ہے لیکن سارا مہینہ سودا آتا رہتا ہے۔ اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ امام صاحب یہ باب شاید اس لیے لائے ہیں کہ ایک روایت یوں ہے کہ جس کے پاس مال نہ ہو تو وہ کوئی چیز نہ خریدے لیکن یہ روایت جھوٹی ہے۔ خواہ مخواہ کو ایک غلط چیز کو مان کر انہیں یہ اہتمام کرنا پڑا ہے۔

لیس بحضرتہ۔ یہ عربی بہت شاندار ہے۔ معنی یہ ہیں کہ بروقت پاس کچھ موجود نہیں اور گھر پر بھی نہیں۔ میرے جیسا عربی جاننے والا یہ ترکیب استعمال نہیں کر سکتا، یہ بخاری ہی کی شان ہے۔ بروقت کا لفظ یاد رکھیے گا۔ میں نے اس کے بارے میں سوچا ہے، اس مفہوم کے لیے مجھے اس سے شاندار لفظ نہیں ملے۔

❁ **حدثنا محمد اخبرنا جریر عن المغیرہ عن الشعبی عن جابر بن عبداللہ قال غزوت مع النبی ﷺ قال کیف تری بعیرک اتبیعنیہ قلت نعم فبعتہ ایاہ فلما قدم المدینۃ غدوث الیہ بالبعیر فاعطانی ثمنہ'.**

ترجمہ:۔ جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوا تو آپ نے میرے اونٹ کے بارے میں پوچھا: تم اس کو کیسا پا رہے ہو، کیا تم اس کو مجھے بیچو گے تو میں نے کہا جی ہاں۔ تو میں نے وہ اونٹ آپ کو بیچ دیا۔ جب آپؐ مدینہ تشریف لائے تو میں آپ کی خدمت میں اونٹ لے کر حاضر ہوا تو آپ نے اس کی قیمت ادا کر دی۔

وضاحت:۔ قیمت موجود نہیں تھی لیکن آنحضرت ﷺ نے اونٹ خرید لیا۔ ثابت ہو گیا کہ بروقت رقم نہ ہو تب بھی کوئی چیز خریدی جا سکتی ہے، یہی امام صاحب کا مطلب ہے اور ٹھیک ہے۔

یہ روایت بار بار گزر چکی ہے لیکن یہاں ان مختصر الفاظ میں اس کی صحیح اسپرٹ واضح نہیں ہو رہی ہے جبکہ پیچھے مفصل واقعہ بیان ہوا تھا۔

❁ **حدثنا معلی بن اسد حدثنا عبدالواحد حدثنا الاعمش قال تذاکرنا عند ابراھیم**

الرھن فی السلم فقال حدثنی الاسود عن عائشۃؓ ان النبی ﷺ اشتری طعامًا من یھودیٍ الی اجلٍ و رھنہ' درعاً من حدید.

ترجمہ:۔ اعمش کہتے ہیں کہ ہم نے ابراہیم کے سامنے ذکر کیا کہ قرض کے معاملہ میں رہن ہو سکتا یا نہیں تو انہوں نے اسود کے حوالہ سے حضرت عائشہؓ کی حدیث بیان کی کہ نبی ﷺ نے ایک یہودی سے ایک معین مدت کے لیے غلہ خریدا اور اپنی لوہے کی زرہ اس کے پاس رہن رکھ دی۔

وضاحت:۔ یہ روایت بھی جگہ جگہ آئی ہے اور اس کے متعلق میں اپنی رائے واضح کر چکا ہوں کہ جن معاملات میں قرآن مجید میں شرعی ضابطہ بیان ہو گیا ہے کسی ایسی بات سے کہ جو آنحضرت ﷺ نے بالکل ابتدائی زندگی میں کی ہے کوئی حجت نہیں قائم کی جا سکتی۔ ظاہر ہے کہ آپ کا ایک یہودی سے قرض لینا بالکل ابتدائی دور کی بات ہو گی جب سورہ بقرہ کے احکام ابھی نازل نہیں ہوئے تھے اور مسلمان بے حد تنگ دست تھے۔ یہ بات کہ آپ نے اپنی زرہ اس کے ہاں رہن رکھ دی یہ بھی اسی دور کی بات ہے۔ چند ہی سالوں کے بعد صورت حال بدل گئی۔ جنگوں کے نتیجہ میں مال غنیمت آنے لگا اور یہودیوں کا اثر بھی مدینہ میں ختم ہونے لگا۔ لہٰذا بعد کے اس دور میں اس واقعہ کے پیش آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ قرآن مجید میں مسلمان اور مسلمان کے درمیان معاملہ کا جو اصول بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اگر آپ قرض کا لین دین کر رہے ہیں تو اس کو لکھ لیں اور اس پر دو گواہ کر لیں۔ آپ رہن نہیں رکھ سکتے۔ سورہ بقرہ میں **فرھان" مقبوضۃ** کی جو شکل بیان ہوئی ہے وہ بھی یہ ہے کہ سفر میں کوئی ضرورت پیش آ جائے تو کوئی چیز رکھ سکتے ہیں لیکن سفر کے خاتمے پر اس کو فوراً واپس کر دیں اور قرض کی دستاویز لکھ لیں۔ میں اس روایت کی تردید نہیں کرتا لیکن یہ ظاہر ہے کہ قرآن کا حکم بعد کا ہے اور آنحضرت ﷺ کا عمل پہلے کا ہے۔ لہٰذا یہ روایت حجت نہیں ہو سکتی۔ اس معاملہ میں میری رائے ان فقہا سے بالکل الگ ہے جو رہن کو جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن کس طریقہ سے وہ اس کو جائز سمجھتے ہیں جب کہ قرآن مجید میں آ گیا ہے کہ سوائے سفر کے یہ معاملہ نہیں ہو سکتا اور سفر کے ختم ہونے پر رہن واپس کرایا جائے گا۔ میرے نزدیک اس روایت سے رہن کا جواز پیدا کرنا قرآن کے خلاف ہے۔

(ترتیب: سید اسحاق علی)

امین احسن اصلاحی

درس موطا امام مالکؒ

(کتاب الاعتکاف کی روایات)

ذکر الاعتکاف: اعتکاف کا ذکر

۱۔ حدثنی یحییٰ عن مالک عن ابن شہاب عن عروۃ ابن الزبیر عن عمرۃ بنت عبدالرحمن عن عائشۃ زوج النبی ﷺ انھا قالت: کان رسول اللہ ﷺ اذا اعتکف یدنی الیّ راسہٗ فارجلہ، و کان لا یدخل البیت الا لحاجۃ الانسان.

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب اعتکاف میں ہوتے تو آپ میری طرف سر قریب کر دیتے اور میں کنگھی کر دیتی لیکن بجز انسانی ضرورت کے گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے۔

وضاحت: اعتکاف کے معنی کسی کام کے ساتھ چمٹ جانے اور اس کے لیے اپنے آپ کو خالص کر لینے کے ہیں۔ دین کے نظام میں اعتکاف ایک ایسی عبادت ہے جس میں آدمی دنیا کے دھندوں سے کٹ کر مسجد میں اللہ کی عبادت اور تفکر و تدبر میں ایک خاص مدت کے لیے مشغول ہو جاتا ہے۔ نبی ﷺ اس عبادت کا اہتمام فرماتے اور تلاوت و حفظ قرآن پر توجہ مرتکز رکھتے۔ اس عبادت کا ذکر قرآن مجید میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ذمہ داریوں کے ضمن میں ہوا ہے۔

چونکہ یہ عبادت تبتل الی اللہ کے لیے ہے اس لیے عبادت کے دوران گھر میں بیوی بچوں کے درمیان آنے جانے پر بھی پابندی ہے۔ مذکورہ حدیث میں اس پابندی کے ضمن میں یہ وضاحت سیدہ عائشہ صدیقہؓ کی ہے کہ حضور مسجد میں اعتکاف کی حالت میں ہوتے تو سر کو حجرہ کی دیوار کے قریب کر دیتے اور میں بالوں میں کنگھی کر دیا کرتی اور ان کو سنوار دیا کرتی۔ اس سے آپ کے اعتکاف میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا تھا۔

ہماری مسجدوں میں نظافت کا اہتمام کرنے پر اعتکاف کرنے والوں کو بہت باتیں سننی پڑتی ہیں حالانکہ صاف ستھرا رہنے پر شریعت نے کوئی پابندی نہیں لگائی۔

۲۔ وحدثنی عن مالک عن ابن شہاب عن عمرۃ بنت عبدالرحمن ان عائشۃ اذا اعتکفت لا تسال عن المریض الا وھی تمشی لا تقف. قال مالک: لایاتی المعتکف

حاجتہ، ولا یخرج لھا، ولا یعین احدا الا ان یخرج لحاجۃ الانسان، ولو کان خارجاً لحاجۃ احد، لکان احق ما یخرج الیہ عیادۃ المریض، والصلاۃ علی الجنائز و اتباعھا. قال مالک: لا یکون المعتکف معتکفا حتی یجتنب ما یجتنب المعتکف. من عیادۃ المریض، والصلاۃ علی الجنائز و دخول البیت الا لحاجۃ الانسان.

ترجمہ: عمرۃ بنت عبدالرحمن کہتی ہیں کہ حضرت عائشہؓ جب اعتکاف کرتیں تو مریض کی مزاج پرسی بھی نہ کرتیں بجز اس کے کہ چلتے چلتے بغیر کھڑے ہوئے پوچھ لیتیں۔ امام مالک کہتے ہیں کہ معتکف آدمی اپنے عام کاموں میں نہ شریک ہو سکتا ہے، نہ ان کی خاطر نکل سکتا ہے اور نہ کسی کی اعانت کر سکتا ہے۔ ہاں یہ کہ وہ حاجت انسانی کے لیے نکل سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کی ضرورت کے لیے نکل سکنے والا ہوتا تو سب سے زیادہ حق دار اس بات کا ہو سکتا تھا کہ وہ مریض کی عیادت کرے اور جنازہ پڑھے اور جنازے کے ساتھ جا سکے۔ مالک کہتے ہیں کہ معتکف جو ہے معتکف نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اجتناب نہ کرے ان تمام چیزوں سے جن سے ایک معتکف اجتناب کرتا ہے۔ یعنی مریض کی عیادت کرنا، نماز جنازہ پڑھنا اور گھر میں داخل ہونا سوائے انسانی ضرورت کے۔

وضاحت: یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہے کہ مریض کی عیادت بھی نہیں کر سکتا، جنازے کے ساتھ بھی نہیں جا سکتا، بیوی مر جائے یا والدین مر جائیں تب بھی نہیں جا سکتا۔ مالکیہ کا مذہب یہی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ماں باپ دونوں ایک ساتھ مر جائیں تب تو نہیں جا سکتا، جائز نہیں۔ اعتکاف باطل ہو جائے گا لیکن معلوم نہیں کہاں سے یہ نکتہ نکالا ہے کہ دونوں میں سے ایک مر جائے تو وجوباً جا سکتا ہے۔ غالباً ان کا فلسفہ یہ ہے کہ ایک مر جائے تو دوسرا بہت پریشان ہوگا تو اس کی پریشانی کم کرنے کے لیے اعتکاف سے نکل کر شریک ہوگا۔ بہر حال اس نکتہ کی علت ان کے ہاں مجھے نہیں ملی۔

اوپر جو کچھ انہوں نے بیان کیا ہے سب اثر ہیں، مرفوع روایت کوئی نہیں اور اثر سے اتنی بڑی عمارت معلوم نہیں کس طرح سے انہوں نے کھڑی کر لی۔

سوال بنیادی طور پر یہ ہے کہ اعتکاف کی عبادت کا اصل مقصد کیا ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ اس کا مقصد ذکر الٰہی، نماز اور تبتل ہے اور وہ ان سب چیزوں کو روکتا ہے یعنی مریض کی عیادت، جنازے میں شرکت وغیرہ۔ اس گروہ میں مالکیہ، امام ابوحنیفہ وغیرہ شامل ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ نہیں، دین کے سب کام ہوں گے۔ مریض کی عیادت، جنازے کے ساتھ جانا یہ سب دین کے کام ہیں۔ اس کی تائید میں سفیان ثوری ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ علماء کبار میں سے تو نہیں ہیں لیکن یہ بات انہوں نے کی ہے تو میرے

نزدیک بڑی معقول بات انہوں نے کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اعتکاف اگر نذر کی شکل ہو تب تو واجب ہوگا ورنہ یہ ایک نفلی عبادت ہے اور اس کا یہ درجہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بیوی مر جائے، ماں باپ میں سے کوئی مر جائے تو آپ اس کے جنازہ میں جا نہیں سکتے۔ جن لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ یہ ذکر الٰہی اور عبادت ہے، انہوں نے کہا کہ یہ عبادت وغیرہ کچھ نہیں، کوئی مر جائے تو کچھ نہیں ہوتا آپ جا نہیں سکتے۔ اور جن لوگوں نے کہا کہ مقصود اس سے توجہ الی اللہ ہے اس لیے دین کے جو کام ہیں معتکف وہ سب کر سکتا ہے، خالصتاً دنیا کے کام نہیں کر سکتا، تو دین و دنیا کی یہ تفریق تو بہر حال موجود ہے۔ تجارت الگ چیز ہے، مریض کی عیادت اور جنازے میں جانا الگ چیز ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر جنازے میں جائے تو اس سے عبادت کو تقویت حاصل ہوگی اور اپنے باپ اور بیٹے کے جنازے میں جائے تو وہی اعتکاف ہوگا اور دین کا حق بھی ادا کرے گا۔ یہ بات بالکل نفسیات انسانی کے خلاف ہے کہ جنازے میں نہ جائے خصوصاً جب کہ اپنے باپ یا بیٹے کا جنازہ ہو۔ میرے نزدیک سفیان ثوری کا مذہب بہت قوی ہے۔ ہمارا مسلک یہی ہے۔ اس بارے میں حدیث کا کوئی حکم نہیں ہے۔ بس اثر ہی ہے اس سے زیادہ نہیں۔ بہر حال مجھے اس معاملہ میں مالکیہ کے مسلک کے خلاف سخت ابرام ہے۔

امام مالکؒ کے فتوے:

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ انہوں نے ابن شہاب سے پوچھا کہ معتکف اپنی ضرورت کے لیے کسی ایسی جگہ جا سکتا ہے جو چھت کے نیچے ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیا مسئلہ ہوا۔ چھت کے نیچے جانے میں اور کھلی جگہ جانے میں کونسا تقویٰ میں فرق آ جائے گا۔ ابن شہاب نے کہا کچھ حرج نہیں ہے۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک جس فتویٰ میں اختلاف نہیں ہے یہ ہے کہ ہر اس مسجد میں اعتکاف کرنا مکروہ نہیں ہے جس میں جمعہ ہوتا ہو۔ کہتے ہیں کہ میرے خیال میں ان مساجد میں جن میں جمعہ نہیں ہوتا اعتکاف میں کراہت کی وجہ صرف یہ ہے کہ معتکف یا تو جمعہ کے لیے مسجد سے نکلے گا یا پھر جمعہ کو چھوڑ دے گا۔ یعنی ان کے نزدیک نکلنا بھی گناہ اور جمعہ کو چھوڑنا بھی گناہ اور کوئی علت نہیں ہے۔ اور اگر ایسی مسجد ہو کہ اس میں جمعہ نہ ہوتا ہو اور معتکف کو جمعہ کے لیے کسی دوسری مسجد میں جانا واجب بھی نہ ہو تو پھر ایسی مسجد میں اعتکاف ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ و انتم عاکفون فی المساجد یہاں لفظ مسجد عام ہے اس کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ جمعہ واجب نہ ہونے کی شکل مثلاً دیہات ہے جہاں جمعہ واجب نہیں ہوتا۔

امام مالک کہتے ہیں معتکف اس مسجد میں رات گزارے گا جس میں اس نے اعتکاف کیا ہے الا

آنکہ اس کی چھولداری مسجد کے لانوں سے کسی لان میں ہے۔ اس بات کی دلیل حضرت عائشہؓ کا قول ہے کہ رسول اللہ ﷺ سوائے حاجت انسانی کے گھر نہیں آتے تھے۔ اور یہ کہ اپنی چھولداری لگائے مسجد کے اندر یا اس کے کسی لان میں اور اس کے سوا اجازت انہوں نے نہیں دی۔

یہ بات تو معقول معلوم ہوتی ہے کہ معتکف کو مسجد کے اندر ہی گزارا کرنا پڑے گا لیکن کہتے ہیں کہ مسجد میں جو مینار ہے تو اس میں وہ قیام نہیں کر سکتا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی اس لیے کہ اگر ایک آدمی کو مینار میں خلوت کی اچھی جگہ مل جاتی ہے تو اعتکاف کے مقصد کے لحاظ سے تو بہت موزوں ہے۔ نماز کے لیے اتر سکتا ہے باقی اس کو تنہائی حاصل ہوگی اور مینار مسجد ہی کا حصہ ہے۔ یہ تصور کسی مرفوع روایت پر مبنی نہیں۔ اعتکاف بہت اچھی عبادت ہے۔ اس میں بہت یکسوئی ہوتی ہے۔ ذہن کو بڑا فائدہ پہنچتا ہے۔ تتبع اور تفکر بہت ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے نظم پر غور ہو سکتا ہے۔ باقی رہ گیا مینار میں رہے تو غیر ضروری کاموں سے زیادہ محفوظ رہے گا۔

امام مالک کا فتویٰ یہ ہے کہ معتکف جس جگہ اعتکاف کرنا چاہتا ہے وہاں سورج ڈوبنے سے پہلے داخل ہو جائے۔ مطلب یہ کہ آپ اعتکاف کرنا چاہتے ہیں تو شام کو غروب آفتاب سے پہلے مسجد میں داخل ہو جائیں۔ ایک اور بھی مسلک ہے جو پہلے مجھے معلوم نہیں تھا کہ فجر کو بھی داخل ہو سکتے ہیں۔ جو شام کو داخل ہونے کا کہتے ہیں، اور معروف طریقہ یہی ہے، تو ان لوگوں کی دلیل غالباً یہ ہے کہ رات کو دن کے ساتھ شامل کیا جائے اور یہ تکمیل کے لیے ہے۔

اعتکاف کرنے والا اپنے اعتکاف میں اس طرح مشغول ہو کہ وہ کسی دوسری چیز کی طرف جو اس کو مشغول کرنے والی ہو جیسے تجارت وغیرہ تو اس میں توجہ نہ دے۔ ہاں اس میں کوئی حرج نہیں کہ اپنے منشی کو اپنے مصالح اور جائیداد وغیرہ کے بارے میں ہدایت دے۔ گویا ہم اور آپ اپنے دفتر کے معاملات میں اپنے ماتحت کو ہدایت دے سکتے ہیں، فائل پر دستخط بھی کر سکتے ہیں۔

امام مالک کہتے ہیں کہ میں نے کسی اہل علم سے یہ بات نہیں سنی کہ وہ اعتکاف کے بارے میں کسی شرط کا ذکر کرتے ہوں۔ امام مالک کی یہ بات معقول ہے اور اہل علم سے مراد مدینہ کے اہل علم ہیں۔ امام مالکؒ نے یہ غالباً ان باتوں کو روکنے کے لیے کہا ہے کہ جو بعد میں لوگوں نے اصل عمل رسول میں اضافہ کر لیں۔ اعتکاف دوسرے اعمال صالحہ مثلاً نماز روزہ وغیرہ کی طرح ایک عمل ہے اور جو شخص اس طرح کی عبادت میں داخل ہو اس کو چاہیے کہ سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق عمل کرے، اپنی طرف سے نئی نئی باتیں نہ ایجاد کرے۔

امام مالک نے کہا کہ اعتکاف کا مفہوم وہی ہے جو جوار کا مفہوم ہے۔ مطلب یہ کہ کنت مجاورا الی المسجد۔ یہ نہیں کہ مجاورت کا الگ تصور کر کے اس کی شرطیں ایجاد کی جائیں اور اعتکاف کی اور شرطیں مانی جائیں۔ معلوم ہوا کہ بعض لوگوں نے مسجد میں رہنے کو مجاورت کا نام دیا ہوگا اور اس کے اصول وضوابط رائج کیے ہوں گے۔ امام صاحب نے ان کا حوالہ دیے بغیر ان کی تردید کردی کہ مجاورت کوئی چیز نہیں۔ آپ کو موطاء میں ان چیزوں کی روایت نہیں ملے گی اور اس اعتبار سے موطا بہت اچھی کتاب ہے۔ اس میں لغویات نہیں ہے۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ شہری کے لیے اور بدوی کے لیے اعتکاف ایک جیسا ہی ہے۔ مطلب یہ کہ شہری کے لیے کچھ اور آداب اور بدوی کے لیے کچھ اور آداب نہیں ہیں بلکہ ایک جیسے آداب ہیں۔ اعتکاف نفلی عبادت ہے اور نذر کی صورت میں البتہ واجب ہے۔

مالا يجوز الاعتكاف الا به

جس چیز کے بغیر اعتکاف جائز نہیں ہوتا۔

۴۔ حدثنی یحییٰ عن مالک انه بلغه ان القاسم بن محمد و نافعاً مولی عبدالله بن عمر قالا لا اعتکاف الا بصیام، یقول الله تبارک و تعالیٰ فی کتابه: و کلوا وشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر ثم اتموا الصیام الی الیل ولا تباشروهن و انتم عاکفون فی المساجد. فانما ذکر الله الاعتکاف مع الصیام. قال مالک: و علی ذالک الامر عندنا انه لا اعتکاف الا بصیام.

ترجمہ: قاسم بن محمد اور نافع، دونوں کا قول ہے کہ لا اعتکاف الا بصیام روزے کے بغیر اعتکاف نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے کہ کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ فجر کی سفید دھاری (شب کی) سیاہ دھاری سے تمہارے لیے نمایاں ہو جائے۔ پھر رات تک روزہ پورا کرو اور تم مسجد میں اعتکاف میں ہو تو بیویوں سے نہ ملو۔ پس اللہ تعالیٰ نے اعتکاف کا روزے کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ مالک کہتے ہیں کہ ہمارا یہی فتویٰ ہے کہ روزے کے بغیر اعتکاف نہیں ہوتا۔

وضاحت: اس روایت میں ایک اثر بیان ہوا ہے کہ روزے کے بغیر اعتکاف نہیں ہوتا اور دلیل اس کی یہ دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اعتکاف کا ذکر روزے کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن یہ دلیل کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے۔ آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ روزہ جو ہے وہ اعتکاف کو موثر بنانے اور اس کے مقاصد حاصل کرنے میں معین

ہے۔ یہ بات تو ٹھیک معلوم ہوتی ہے کہ اعتکاف کا جو مزاج ہے وہ متقضی ہے کہ اس کے ساتھ روزہ بھی ہو اس لیے کہ تبتل کی عبادت میں روزہ بہت زیادہ معین ہو سکتا ہے لیکن روزہ شرط اس لیے نہیں ہے کہ اعتکاف کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ لازماً رمضان ہی میں ہو۔ یہ اور دنوں میں بھی ہو سکتا ہے۔ میرے نزدیک روزہ شرائط میں سے نہیں لیکن اعتکاف کے موثر ہونے میں اس کو بڑا دخل ہے اور اعتکاف غیر رمضان میں بھی ہو سکتا ہے۔

فرض کر لیجیے آپ نے اعتکاف کی نیت کی اور نہیں بیٹھ سکے تو مالکیہ کا مذہب بھی یہی ہے، اور عقل کے مطابق بھی یہی ہے کہ دوسرے دنوں میں اس کو پورا کریں۔ اور دوسرے دنوں میں آپ کریں تو روزے روزے کے ساتھ کریں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بغیر روزے کے کریں۔ کسی نص قطعی سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ روزہ اس کے شرائط میں سے ہے لہٰذا اس کو شرط قرار دینا ایک تشدد ہے۔

خروج المعتكف فى العيد

معتکف کا عید کے لیے نکلنا

۵۔ عن زیاد بن عبدالرحمن قال: حدثنا مالک عن سمی مولی ابی بکر بن عبدالرحمن ان ابابکر بن عبدالرحمن اعتکف، فکان یذهب لحاجته تحت سقیفة فی حجرة مغلقة فی دار خالد بن الولید، ثم لا یرجع حتی یشهدا لعید مع المسلمین.

ترجمہ: سمی، مولیٰ ابوبکر بن عبدالرحمٰن سے مروی ہے کہ ابوبکر بن عبدالرحمٰن نے اعتکاف کیا تو وہ اپنی ضرورت کے لیے ایک سقیفہ کے نیچے جایا کرتے جو ایک حجرہ میں جو خالد بن ولید کے احاطہ میں تھا بنا ہوا تھا۔ پھر اعتکاف سے وہ نہیں لوٹتے تھے یہاں تک کہ عید کی نماز مسلمانوں کے ساتھ پڑھ لیتے تھے۔

وضاحت: سقیفہ یعنی ایک چوپال سی جو چوہدری لوگ بناتے ہیں۔

یہ ایک اثر ہے، کوئی مرفوع روایت نہیں ہے۔ ابوبکر بن عبدالرحمٰن یہ نہیں کرتے تھے کہ چاند دیکھ لیا تو گھر آ گئے بلکہ عید کی نماز پڑھ کر گھر آتے تھے۔ ایک آدمی اپنے طور پر یہ کر سکتا ہے لیکن چاند ہو جانے کے بعد جب رمضان ختم ہو گیا تو وہ گھر آ سکتا ہے۔ اپنے طور پر کوئی شخص اپنے ذوق کے مطابق کرتا ہے تو کرے لیکن ایک متشددانہ طریقہ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے رمضان کے بعد چھ روزے اور لگا دیے۔ اس کی کوئی عام بنیاد نہیں ہے۔

۶۔ حدثنی زیاد عن مالک انه رای بعض العلم اذا اعتکفوا العشر الاواخر من

رمضان لا یرجعون الی اھالیھم حتی یشھدوا لفطر مع الناس، قال زیاد، قال مالک: و بلغنی ذالک عن اھل الفضل الذین مضوا، و ھذا احب ما سمعت الی فی ذالک.

ترجمہ: زیاد، مالک سے روایت کرتے ہیں کہ بعض اہل علم کو انہوں نے دیکھا کہ وہ جب رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کرتے تو گھر والوں کے پاس نہیں آتے تھے مگر عید کی نماز لوگوں کے ساتھ پڑھ کر۔ زیاد کہتے ہیں کہ مالک نے کہا کہ مجھے یہ بات اگلوں میں سے اچھے لوگوں سے پہنچی ہے۔ اور پھر کہتے ہیں اس بارے میں جو میں نے سنا ہے محبوب تر میرے نزدیک یہی ہے۔

وضاحت: یہ ایک رائے ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مالکیہ کا رجحان اسی طرف ہے۔ اس کی کوئی بنیاد نہیں، محض بعض لوگوں کا ذوقی مسلک ہے۔

قضاء الاعتکاف

اعتکاف کی قضا کے بارے میں

۷۔ حدثنی زیاد عن مالک عن ابن شھاب عن عمرة بنت عبدالرحمن عن عائشة ان رسول اللہ ﷺ اراد ان یعتکف، فلما انصرف الی المکان الذی اراد ان یعتکف فیه وجد اخبیة خباء عائشةؓ، و خباء حفصةؓ، و خباء زینبؓ فلما رآھا سال عنھا فقیل له ھذا خباء عائشةؓ و حفصةؓ، و زینبؓ، فقال رسول اللہ ﷺ البر تقولون بھن، ثم انصرف فلم یعتکف حتی اعتکف عشراً من شوال.

ترجمہ: عمرة بنت عبدالرحمن حضرت عائشہؓ سے روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اعتکاف کا ارادہ کیا تو جب آپ اس جگہ گئے جس جگہ اعتکاف کا ارادہ تھا تو وہاں آپ نے کئی خیمے پائے جو حضرت عائشہؓ حضرت حفصہؓ اور حضرت زینبؓ کے تھے۔ آپ نے ان کو دیکھا تو اس کے بارے میں پوچھا آپ کو بتایا گیا کہ یہ حضرت عائشہؓ حضرت حفصہؓ اور حضرت زینبؓ کے خیمے ہیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم اس کو نیکی سمجھتے ہو؟ پھر آپ لوٹ آئے اور اعتکاف نہیں کیا یہاں تک کہ شوال کے ایک عشرہ میں کیا۔

وضاحت: اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ اعتکاف کی نیت اگر کوئی کر بیٹھے تو اس کو پورا کرنا چاہیے اور اگر ان دنوں میں پورا نہ کر سکے تو دوسرے دنوں میں نیت پوری کرنی چاہیے۔ شوال میں کرے یا جب

چاہے کرلے۔ یہ نبی ﷺ کے عمل سے ثابت ہوا۔

بعض مرتبہ تنافس فی الخیر یعنی نیکی میں ایک دوسرے سے سبقت کی کوشش میں بھی ایک طرح کی رقابت، مقابلہ اور نمائش کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ تنافس فی الخیر ہو بھی تو خاموشی کے ساتھ ہونا چاہیے۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک نابینا بڑھیا تھی۔ حضرت عمرؓ اس کے پاس کچھ لے جاتے اور کھلا پلا دیتے تھے۔ ایک روز گئے تو اس نے کہا کہ بیٹے ابھی تو تم آئے تھے اور مجھے کھلا کر گئے ہو پھر کیوں آ گئے۔ حضرت عمرؓ چلے آئے۔ کہنے لگے کہ میں تاڑ گیا یہ حضرت ابوبکرؓ کا کام ہوگا، وہی مجھے اس معاملے میں شکست دے سکتے ہیں۔ چنانچہ تحقیق کی تو پتہ چلا کہ حضرت ابوبکرؓ ہی تھے۔

یہ تو ٹھیک ہے کہ تنافس فی الخیر ہونا چاہیے لیکن یہاں جس طرح واقعہ نمایاں ہو گیا تو ازواج مطہرات تو نیک نیتی کے ساتھ اعتکاف کرنا چاہ رہی ہوں گی لیکن شکل اس کی بدنما ہو گئی اور ریا کی شکل پیدا ہو گئی۔ آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا کہ کیا تم اس کو نیکی سمجھتے ہو تو اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ لوگوں کے ذہنوں میں بھی یہ بات رہی ہو۔ سیدات نے نیکی ہی کی نیت سے یہ کیا تھا لیکن بعض مرتبہ ایک چیز کا باطن نگاہوں کے سامنے نہیں ہوتا، اس پر روشنی ڈالی جائے تب پتہ چلتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے کمزوری کی نشاندہی فرمائی کہ اس میں شائبہ ریا ہو سکتا ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام کے معاملہ میں بھی اس کی مثال ہے۔ جب وہ گھر سے نکلے تو ان کے نکلنے میں بھی ایک چیز مضمر تھی جس کی ان کو اطلاع نہیں تھی اور پھر جن واقعات سے اللہ تعالیٰ نے ان کو دوچار کیا اس سے وہ اپنے مخفی باطن پر مطلع ہوئے۔ ہم اور آپ بہت سے کام ایسے کرتے ہیں کہ جن کے باطن پر پوری نظر نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے آدمی کو صاحب نظر اور استاد کی ضرورت پڑتی ہے۔ سقراط کے متعلق پڑھا ہوگا کہ اس کے شاگرد جتنے تھے وہ سب اسے کہتے، اے استاد، اے استاد۔ سیدنا مسیح کے بارے میں بھی آتا ہے کہ انہیں سب استاد کہتے تھے۔

امام مالک کے فتوے:

امام مالک کہتے ہیں کہ اعتکاف کے دوران کوئی شخص بیمار ہو گیا اور گھر آ گیا تو تندرست ہونے کے بعد وہ اعتکاف پورا کرے گا، چاہے رمضان میں کرے یا رمضان کے بعد شوال وغیرہ کسی اور مہینے میں کرے۔ امام مالک نے اس کو واجب گردانا ہے۔ لیکن واجب کیوں ہے؟ رمضان کے اندر اعتکاف اگر نذر کی حیثیت سے کیا ہے تب تو واجب ہے لیکن اگر نذر کی حیثیت سے نہیں کیا، فضیلت سمجھ کر کیا ہے تو واجب کیوں ہوگا۔ مالکیہ غالباً اس بنیاد پر کہتے ہیں کہ جب ایک آدمی کسی نیکی کی نیت کرلے تو قدم پیچھے

نہیں بنانا چاہیے۔ اس کو پورا کرنا چاہیے۔ جیسا کہ نبی ﷺ نے کیا تھا۔

نبی ﷺ رمضان میں اعتکاف کرنا چاہتے تھے لیکن مسجد کی صورت حال دیکھ کر اعتکاف نہیں کیا اور لوٹ آئے۔ اور پھر شوال کے دس دنوں میں پورا کیا۔ امام صاحب نے اسی روایت کا حوالہ دیا ہے۔ میرے نزدیک جو دن رہ گئے ان کا بعد میں اعتکاف کرنا بہتر ہے لیکن واجب نہیں۔ ہاں اگر آدمی کی نیت دس دن کے اعتکاف کی تھی تب یہ نذر ہوگی اور باقی دنوں کا اعتکاف پورا کرنا ہوگا۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اعتکاف نفلی طریقہ پر کیا جائے یا وجوب کے طریقہ پر کیا جائے، حلت و حرمت میں دونوں کا معاملہ ایک ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے یعنی نفلی ہونے کی وجہ سے کوئی ڈھیل نہیں ہے۔ اور اعتکاف نفلی ہو چاہے واجب، ضابطہ ایک ہی ہوگا۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے نفلی نماز ہے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ بے وضو پڑھ لیں، احکام ایک ہی ہیں۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر دوران اعتکاف عورت کو نسوانی حالت پیش آجائے اور وہ گھر لوٹ آئے تو طہر کی حالت میں واپس آنے پر وہ اپنا اعتکاف پورا کرے گی۔ یعنی جتنا اعتکاف وہ کر چکی تھی اس کو شمار کر کے باقی کو پورا کرے گی۔ مطلب یہ کہ اس کا کھاتہ کھلا رہے گا اور اسی طریقہ سے اس عورت کا حکم ہے جس پر مسلسل دو مہینے کے روزے واجب ہوئے۔ جب نسوانی حالت پیش آجائے تو وہ روزے چھوڑ دے گی اور جیسے ہی طہر کی حالت میں آئے گی دوبارہ شروع کر دے گی، اس میں خلل نہیں واقع ہوگا۔

۹۔ وحدثنی زیاد عن مالک عن ابن شہاب ان رسول الله ﷺ کان یذھب لحاجة الانسان فی البیوت. قال مالک: لا یخرج المعتکف مع جنازہ ابویہ، ولا مع غیرھما.

ترجمہ: ابن شہاب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ضرورت کے لیے گھر میں جاتے تھے۔ مالک کہتے ہیں کہ معتکف اپنے ماں باپ کے جنازے میں نہیں جائے گا اور ان دونوں کے علاوہ کسی اور کے جنازے میں بھی نہیں جائے گا۔

وضاحت: رسول اللہ ﷺ ضرورت کے لیے گھر میں جاتے تھے یعنی ضروری نہیں کہ کھلی جگہ میں جائیں، گھر میں بھی جا سکتے ہیں۔

یہ بات کہ معتکف اپنے ماں باپ کے جنازے میں نہیں جا سکتا، بالکل مہمل ہے۔ اس معاملہ میں سفیان ثوری، گو وہ اس درجے کے فقیہ نہ ہوں، کا مذہب ٹھیک ہے کہ جتنے بھی دین کے کام ہوں جو مسجد میں یا اس سے نکل کر کیے جا سکتے ہیں۔ مسجد سے باہر نکلنے کا مطلب یہ نہیں کہ بازار چلے گئے لیکن جنازے میں

شرکت خاص طور سے جب وہ ماں باپ کا یا بیوی بچوں میں سے کسی کا ہو تو اس سے اعتکاف کی روح میں اضافہ ہوگا یا کمی ہوگی؟

النکاح فی الاعتکاف

اعتکاف کے دوران نکاح کرنا

امام مالک کے فتوے:

اس باب میں کوئی مرفوع حدیث یا اثر نہیں ہے۔ صرف امام صاحب کے فتوے ہیں۔

امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اعتکاف کرنے والا دوران اعتکاف نکاح بھی کر سکتا ہے بشرطیکہ زن و شوہر کا تعلق قائم نہ ہو اور اسی طرح معتکف عورت منگنی کی نوعیت کا نکاح کر سکتی ہے۔ اور معتکف پر اپنے اہل کے بارے میں رات میں بھی وہی چیز حرام ہوگی جو دن میں حرام ہے۔ اور کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنی بیوی کو اس نوعیت سے ہاتھ لگائے جس نوعیت میں جنسی لذت حاصل ہو۔ میں نے کسی سے نہیں سنا کہ وہ مکروہ سمجھتا ہو معتکف کے لیے اور معتکفہ کے لیے کہ وہ اپنے اعتکاف میں نکاح کرے بشرطیکہ زن و شوہر کا تعلق نہ ہو۔

امام مالک کے اس فتویٰ کا پس منظر بھی رہا ہوگا۔ ان کے زمانے میں بعض لوگوں نے فتویٰ دیا ہوگا کہ اعتکاف کے دوران نکاح کرنا مکروہ ہے۔ امام مالک نے فتویٰ دیا کہ نہیں۔ اگر زن و شو کا تعلق قائم نہ ہو تو جائز ہے۔

ما جاء فی لیلة القدر

لیلۃ القدر کے بارے میں جو مذکور ہے

۱۱۔ حدثنی زیاد عن مالک عن یزید بن عبداللہ بن الھاد عن محمد بن ابراھیم بن الحارث التیمی عن ابی سلمة بن عبدالرحمن عن ابی سعید الخدریؓ انه قال کان رسول اللہ ﷺ یعتکف العشر الوسط من رمضان فاعتکف عاماً حتی اذا کان لیلة احدی و عشرین و ھی اللیلة التی یخرج فیھا من صبحھا من اعتکافه وقال من اعتکف معی فلیعتکف العشر الاواخر و قد اریت ھذہ اللیلة، ثم انسیتھا و قدرایتنی اسجد من صبحھا فی ماء و طین فالتمسوھا فی العشر الاواخر و التمسوھا فی کل

وتر۔ قال ابو سعیدؓ فامطرت السماء تلک اللیلۃ و کان المسجد علی عریش فوکف المسجد، قال ابو سعید فابصرت عینای رسول اللہ ﷺ انصرف و علی جبھتہ و انفہ اثر الماء و الطین من صبح لیلۃ احدی و عشرین۔

ترجمہ: ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ رمضان کے بیچ کے عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ ایک سال آپ نے اعتکاف کیا یہاں تک کہ جب اکیسویں رات ہوئی اور وہی رات ہوتی تھی کہ جس کی صبح کو آپ اعتکاف سے نکلا کرتے تھے تو آپ نے فرمایا کہ جن لوگوں نے میرے ساتھ اعتکاف کیا ہے ان کو چاہیے کہ آخری عشرہ کا بھی اعتکاف کریں۔ اور مجھے یہ رات دکھائی گئی اور پھر مجھ سے فراموش کردی گئی اور میں نے دیکھا کہ میں اس کی صبح کو پانی اور کیچڑ میں سجدہ کر رہا ہوں تو اس کو تلاش کرو عشرہ آخر میں اور اس کو تلاش کرو ہر طاق رات میں۔ ابوسعید کہتے ہیں کہ آسمان سے اس رات کو بارش ہوئی اور مسجد چھپر پر تھی تو مسجد ٹپکی۔ ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ میری آنکھوں نے دیکھا رسول اللہ ﷺ کو کہ آپ لوٹے اور آپ کی پیشانی اور ناک پر پانی اور کیچڑ کا کچھ اثر تھا، اکیسویں رات کی صبح کو۔

وضاحت: اس روایت کے متعلق یہ آتا ہے کہ لیلۃ القدر کے بارے میں یہ اصح الروایات ہے۔ اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ بقیہ روایات کا کیا حال ہوگا۔

میں نے ترجمہ کردیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں کہ آنحضرت ﷺ بیچ کے عشرہ میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔ ایک سال آپ نے اعتکاف کیا تو جب اکیسویں رات ہوئی اور یہ وہی رات ہے جس کی صبح آپ اعتکاف سے نکلا کرتے تھے تو آپ نے کہا کہ جن لوگوں نے میرے ساتھ اعتکاف کیا ہے انہیں چاہیے کہ آخری عشرے کا اعتکاف بھی کریں۔ مجھے یہ رات دکھائی گئی اور پھر بھلا دی گئی۔ میں نے یہ دیکھا کہ اس کی صبح کو پانی اور کیچڑ میں سجدہ کر رہا ہوں تو اس کو آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔ مطلب یہ ہوا کہ آپ وسط عشرہ میں اعتکاف بیٹھتے تھے اور مقصود یہ ہوتا تھا کہ اس میں لیلۃ القدر ہوگی گویا اس کی تلاش ہوتی تھی۔ اکیسویں رات ہوئی اور اس کی صبح کو آپ نکلے اور کہا کہ جن لوگوں نے میرے ساتھ اعتکاف کیا ہے ان کو چاہیے کہ آخری عشرے کا بھی اعتکاف کریں۔ اس لیے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عشرہ میں (وسط عشرہ) میں تو نہیں ملی، آخری عشرہ میں ملے گی۔ مجھے یہ رات دکھائی گئی اور بھلا دی گئی اور میں نے دیکھا کہ اس کی صبح کو میں پانی اور کیچڑ میں سجدہ کر رہا ہوں۔

اب یہاں سے روایت کچھ الجھ گئی ہے اکیسویں کی رات تک آپ نے لیلۃ القدر کو نہیں پایا اور اس کی صبح کو آپ نے ہدایت دی کہ جو لوگ میرے ساتھ اعتکاف میں تھے آخری عشرہ کا اعتکاف کریں۔

آپ نے یہ بھی کہا کہ وہ رات مجھے دکھائی گئی لیکن بھلا دی گئی۔ ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ اسی رات کو یعنی اکیسویں کی رات کو بارش ہوئی۔ مسجد عریش پر تھی، عرش کے معنی تو چھت کے ہوتے ہیں لہٰذا ترکیب کچھ الٹ گئی ہے۔ مسجد کی چھت کھجور وغیرہ کے پتوں کی چھت تھی۔ یعنی مسجد چھپر کی طرز کی تھی اور وہ ٹپکی گویا یہاں بیان میں تجاوز ہوگیا ہے۔ ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے صبح کی نماز سے سلام پھیرا تو آپ کی پیشانی پر پانی اور کیچڑ کا اثر تھا۔ مطلب یہ ہوا کہ ابوسعید کے نزدیک اکیسویں شب کو لیلۃ القدر تھی جبکہ نبی ﷺ فرما چکے ہیں کہ لوگ آخری عشرے میں اس رات کو تلاش کریں۔ تو اس تضاد کی تاویل کیا ہوگی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ روایت کرنے میں راویوں نے گھپلا کیا ہے۔ اب اس کا نتیجہ یہ ہے کہ لیلۃ القدر کے بارے میں ابن ابی الرحاب فرماتے ہیں کہ چالیس قول ہیں۔ ہر شخص کا الگ الگ قول ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے، وجہ یہ ہے کہ روایت بالمعنی ہے۔ آنحضرت ﷺ سے اگر روایت بالمعنی جائز ہے تو بعد کے راوی جو درجہ بدرجہ روایت کرتے ہیں تو کیا وہ بالمعنی نہیں کرسکتے، وہ بھی کریں گے۔

اب میں نے اور روایات دیکھنے کی کوشش کی تو مسلم اور بخاری میں روایت آتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے لیلۃ القدر کی جستجو میں پہلے عشرہ میں اعتکاف کیا، دوسرے عشرہ میں بھی کیا اور پھر آپ نے فرمایا کہ تیسرے عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔ مسلم میں اس طرح کی کوئی ہدایت نہیں کہ جو لوگ میرے ساتھ ہیں آخری عشرہ میں تلاش کریں۔ یہاں تک بات سمجھ میں آتی ہے اور مسلم وغیرہ میں جھگڑے نہیں ہیں۔

رہ گئی یہ بات کہ مجھے دکھایا گیا اور پھر بھلا دیا گیا تو ظاہر ہے کہ یہ رویا میں دکھایا گیا اور علامت اس کی یہ بتائی گئی ہوگی کہ اس کی صبح کو یوں ہوگا۔ تو یہ ممکن ہے ٹھیک ہو لیکن راوی صاحب نے اسی رات کو مطلوبہ رات قرار دے دیا اور کہا کہ میں نے آپ کی پیشانی پر یہ اثر دیکھا ہے۔ تو یہ نتیجہ راوی نے خود نکالا ہے۔ اتنی بات تو صحیح ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہو لیکن اکیسویں رات تک یہ بات نہیں ہوئی تھی۔ یہ بھی قرین ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہوگا کہ یہ رات مجھے دکھائی گئی مگر اور آدمیوں کے جھگڑنے کی وجہ سے مجھے بھلا دی گئی کہ کون سی رات تھی۔

آنحضرت ﷺ کی خواہش تھی کہ معین طور پر معلوم ہو کہ کون سی رات ہے، آپ کو خواب میں کچھ اشارہ ہوا بھی لیکن بہر حال پہلے دونوں عشروں میں یہ رات نہیں ملی تو آپ نے فرمایا تیسرے عشرے میں تلاش کرو۔

اب چالیس جو قول ہیں ان میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں

اٹھالی گئی۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ وہ سال بھر گردش کرتی رہتی ہے اور ایک گروہ کہتا ہے کہ وہ رمضان میں ہے۔ رمضان میں لیلۃ القدر ہونے کی بنیاد قرآن میں ہے۔ فرمایا انا انزلناہ فی لیلۃ القدر اور دوسری جگہ فرمایا کہ شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن جس سے یہ بات نکلی کہ قدر کی رات رمضان میں ہے۔ کیسی شاندار رات ہے کہ فرمایا ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس رات میں فرشتے اور جبریل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر معاملہ میں اذن لے کر اترتے ہیں اور ہر طرف سکھ ہی سکھ ہوتا ہے۔ وہ فجر تک ہوتی ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ وہ رات اس نظام کائنات کا حصہ ہے اور اس کے اٹھالے جانے کے کوئی معنی نہیں۔ اس لیے کہ جب نظام کائنات کا حصہ ہے تو جب تک کائنات ہے وہ رات بھی ہے۔ فرشتے ہر معاملہ میں حکم نامے لے کر اترتے ہیں۔ معاملات سے مراد وہ معاملات ہیں جو اس دنیا کے نظم و نسق سے متعلق ہیں۔ یعنی عام سے مراد خاص ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید معمولی چیز نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی اسکیم کے تحت یہ اس رات میں اتارا گیا ہے۔ یہ رات سلامتی ہی سلامتی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس رات شیاطین اور ارواح خبیثہ پر پابندیاں ہوتی ہیں۔

ایک قول بہت بڑے لوگوں کا ہے کہ یہ رات پورے سال میں گردش کرتی ہے، یہ خیال درست نہیں ہے۔ کبیسہ کا اصول عربوں میں رائج تھا تو چونکہ رمضان ہر سال اپنی جگہ بدل لیتا اسی طرح لیلۃ القدر بھی گردش کرتی رہتی۔ اس اصول کو حجۃ الوداع میں آنحضرت ﷺ نے ختم کردیا۔ اب رمضان اپنی جگہ ہی پر آتا ہے اور یہ رات رمضان ہی میں ہے۔ یہ رات معین بھی ہوگئی لیکن پھر وہ حضور کو فراموش کرا دی گئی تاکہ آپ کی توجہ پورے رمضان پر رہے۔ پورا رمضان آپ فکرمند رہیں، اس کی تلاش میں رہیں۔ اس قسم کی رات ہونی چاہیے۔ ہر کام کے لیے ایک وقت موزوں ترین ہوتا ہے یہاں تک کہ گندم اور مکئی بونے کے لیے ایک وقت ہے، اگر اس وقت کو گزار کر آپ بوائی کریں گے تو برکت کم ہو جائے گی اور بالکل ہی موسم گزار کر کریں تو ہوسکتا ہے کچھ بھی حاصل نہ ہو۔ ایام کا بھی اعتبار ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اگر قرآن کے نزول کے لیے ایک خاص رات معین کی تو فی الواقع اسے نہایت بابرکت ہونا چاہیے۔ بلاشبہ وہ ہزار مہینوں سے بہتر ہوگی۔

(ترتیب: ماجد خاور)

محبوب سبحانی

بت پرستی کی تاریخ

تمدن کے قدیم دور میں قوموں کے اجتماعی رشتے ان کے بتوں کے تعلق سے قائم ہوتے تھے۔ مختلف قبائل مختلف بتوں کی پوجا کرتے تھے اور جب ان میں سے کوئی قبیلہ دوسرے قبیلہ کے ساتھ رشتۂ اتحاد قائم کرنا چاہتا تو اپنے بت کے ساتھ اس قبیلہ کے بت کی بھی پرستش شروع کردیتا تھا۔ لہٰذا جس سلطنت کے زیر سایہ جتنی قومیں ہوتی تھیں اتنے ہی ان کے اصنام بھی ہو جاتے تھے۔ قدیم زمانہ میں قومی مصالح میں سب سے زیادہ اہمیت اسی بت پرستی کو حاصل تھی۔ اجتماع و اتحاد کی تمام عمارت اسی بنیاد پر قائم ہوتی تھی اس وجہ سے اس میں جتنی بھی توسیع ہو وہ عین مطلوب تھی۔ روم اور ہندوستان کی بت پرست قوموں کی تاریخ اس حقیقت کی نشان دہی کرتی ہے۔

علامہ ابن جوزی نے اپنی کتاب 'تلبیس ابلیس' میں بت پرستی کی تاریخ بیان کی ہے۔ اس کے بعض ضروری حصے یہاں درج کیے جارہے ہیں۔ ان کے مطابق ہشام بن محمد بن السائب کلبی نے اپنے باپ کے حوالے سے بتایا ہے کہ بت پرستی کی بنیاد اس طرح ہوئی کہ جب آدم علیہ السلام نے انتقال کیا تو شیث بن آدم کی اولاد نے ان کی میت اس پہاڑ کے غار میں رکھی جس پر وہ جنت سے اترے تھے۔ اس کا نام نوذ ہے اور وہ روئے زمین کے پہاڑوں میں سے سب سے زیادہ سرسبز ہے۔ شیث کی اولاد اس پہاڑ کے غار میں آدمؑ کی میت کے پاس جایا کرتی اور اس کی تعظیم کرتی۔ یہ دیکھ کر قابیل کی اولاد میں سے ایک نے کہا کہ اے بنی قابیل! دیکھو بنی شیث کے پاس ایک شے ایسی ہے وہ جس کے گرد گھومتے اور اس کی تعظیم کرتے ہیں لیکن تمہارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر تم کہو تو تمہارے لیے بھی کوئی ایسی ہی چیز بنادی جائے۔ پھر اس نے ایک مورت گھڑ دی۔ یہی پہلا شخص ہے جس نے مورت بنائی جس کی بنی قابیل تعظیم کرتے اور اس کا طواف کرتے۔

عرب میں بت پرستی کے متعلق یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ مکہ میں بنی اسماعیل کی تعداد جب بہت بڑھ گئی تو قوم عمالقہ کو وہاں سے نکال دیا گیا لیکن مکہ میں اب گنجائش نہیں رہی تھی اس لیے وہ روزگار کی تلاش میں دوسری جگہوں پر پھیلے۔ ان میں سے جو کوئی بھی مکہ سے باہر جاتا وہ اپنے ساتھ حرم سے ایک پتھر لے جاتا۔ جہاں کہیں وہ ٹھہرتے وہاں اس پتھر کو رکھ لیتے اور طواف کعبہ کی طرح اس کا طواف کرتے۔ اس کو حرم کا قائم مقام سمجھتے۔ بعد میں آنے والی نسلیں اپنے قدیم طریقہ کو بھول گئیں اور انہوں نے ان پتھروں

کی عبادت شروع کردی۔

مکہ کی ہر وادی میں ایک بت تھا۔ جس کو اسی علاقے کے لوگ پوجتے تھے۔ جب ان میں سے کوئی سفر پر جاتا تو سب سے پہلے وہ اس بت کو چھوتا اور جب سفر سے واپس آتا تو سب سے پہلے احاطہ میں داخل ہو کر اس کو چھوتا۔ بعضوں نے بتوں کے گھر بھی بنا لیے تھے۔ جس کے پاس کوئی مورت نہ ہوتی وہ کوئی اچھا پتھر تلاش کر کے رکھ لیتا اور پھر اس کا طواف کرتا۔ مشرکین ان کو انصاب کہتے تھے۔ جب کوئی مشرک سفر کو جاتا اور کسی منزل پر اترتا تو چار پتھر تلاش کر کے لاتا۔ ان میں سے جو پتھر اس کو اچھا معلوم ہوتا اس کو اپنا رب بنا لیتا اور باقی سے اپنی ہانڈی کا چولہا بنا لیتا اور جب وہاں سے کوچ کرتا تو اس کو وہیں چھوڑ جاتا۔ پھر جب وہ دوسری منزل پر اترتا تو وہاں دوسرا رب تلاش کر لیتا۔

پانچ بت بڑے قدیم اور سخت جان ہیں۔ زمانہ کے حوادث سے ہمیشہ بچ نکلتے رہے ہیں۔ طوفان نوح میں بھی یہ نہ صرف بچ نکلے بلکہ عرب کی سرزمین پر پہنچ گئے۔ جہاں ان کی دوبارہ پرستش شروع ہوگئی۔ ان کا نام ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر ہیں جن کا قرآن میں بھی ذکر ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ سب بندگان صالح تھے اور ایک ہی مہینہ میں ان سب نے انتقال کیا۔ ان کی برادری کو ان کی موت کا سخت صدمہ ہوا۔ بنی قابیل کے ایک شخص نے کہا کہ اگر تم چاہو تو میں ان کی صورتوں کی پانچ مورتیں گھڑ دوں۔ اس طرح سے وہ تمہارے سامنے ہوں گے لیکن مجھ میں اتنی قدرت نہیں کہ ان کے اندر روحیں پھونک سکوں۔ پس اس نے ان کے لیے پانچ بت بنا دیے جو ان کی صورتوں کے موافق تھے۔ ان کو ایک مرکزی مقام پر نصب کر دیا گیا۔ پھر لوگ اپنے بھائی، چچا، چچیرے بھائی کی مورت کے پاس آیا کرتے اور ان کی تعظیم کرتے اور اس کے گرد پھیرے لگاتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعظیم و تکریم میں اضافہ ہوتا گیا۔ پھر ایک زمانہ آیا کہ لوگ کہنے لگے کہ ہمارے آباؤ اجداد بلاوجہ ان کی عزت و احترام نہیں کرتے تھے بلکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ سے ان کی سفارش کریں گے۔ ان کو سفارشی مان لینے کے بعد ان مورتوں کی عبادت شروع ہوگئی اور ان کی شان بزرگ و برتر قرار دے دی گئی۔ جب طوفان نوح آیا تو پانی ان کو ایک زمین سے دوسری زمین تک اچھالتا رہا یہاں تک کہ پانی کے تھپیڑوں نے ان کو جدہ میں لا کر پھینک دیا۔ جب پانی خشک ہوا تو یہ مورتیں ساحل کے کنارے پر پڑی رہیں اور آندھیوں سے ریگ صحرا اڑ کر ان پر پڑتی رہی یہاں تک کہ یہ ریت میں دفن ہوگئیں۔

روایات کے مطابق ایک کاہن عمرو بن لحی تھا جس کے قبضہ میں ایک جن تھا جس نے اسے بتایا کہ جدہ کے کنارے ریت میں مورتیں دبی ہوئی ہیں ان کو نکال کر تہامہ لے آؤ اور پھر عربوں کو ان کی

عبادت کی طرف بلاؤ۔ عمرو بن لحی نے نشانات ڈھونڈ کر ان کو ریت سے نکال لیا اور پھر ان کو تہامہ لے آیا۔ جب حج کا موسم آیا تو اس نے اہل عرب کو ان بتوں کی پرستش کے لیے بلایا۔ عوف بن عذرہ بن زید لات نے اس کی بات مان لی تو اس نے ود نام کا بت اس کے حوالے کیا۔ عوف نے ود کو وادی القریٰ کے قریہ دومۃ الجندل میں رکھا اور اس کے نام سے منسوب کر کے اپنے بیٹے کا نام عبدود رکھا۔ یہی شخص سب سے پہلے اس بت کے نام سے منسوب ہوا۔ عوف نے اپنے دوسرے بیٹے عامر کو اس بت کا مجاور مقرر کیا۔ اس وقت سے اس کی اولاد برابر اس بت کی پوجا کرتی رہی۔ روایت کے مطابق اس کی مورت مرد کی صورت تھی۔ اس پر دو حلے بنائے گئے تھے۔ ایک ازار کی طرح تھا اور دوسرا اوپری حصہ تھا۔ اس کے ایک طرف تلوار لٹکی ہوئی تھی اور کندھے پر کمان تھی۔ آگے ایک نیزہ تھا جس پر جھنڈا لگا ہوا تھا اور ترکش میں تیر تھے۔ رسول اکرمؐ نے غزوہ تبوک کے موقع پر اس بت کو مسمار کرنے کے لیے حضرت خالد بن ولید کو بھیجا تھا۔ عبدود اور عامر کی اولاد ان کی راہ میں مزاحم ہوئی۔ اس موقع پر لڑائی ہوئی جس میں انہیں شکست ہوئی اور حضرت خالد بن ولید نے اس بت کو توڑ ڈالا۔

عمرو بن لحی کی دعوت کی طرف دوسرا جو شخص راغب ہوا وہ مضر بن نزار تھا۔ اس نے قبیلہ ہذیل کے ایک شخص کو ایک بت دیا جس کو سواع کہتے تھے۔ اس شخص کا نام حارث بن تمیم بن سعد بن ہذیل بن مدرکہ بن الیاس بن مضر تھا۔ یہ بطن نخلہ کی زمین رہاط میں آباد تھے اس لیے اس کے قرب و جوار کے مضر قبائل اس کی عبادت کرنے لگے۔

اس طرح مذحج نے بھی عمرو بن لحی کا کہنا مان لیا تو اس نے انعم بن عمرو المرادی کو وہ بت دیا جس کا نام یغوث تھا جس کو یمن کے ایک ٹیلہ پر نصب کیا گیا اور مذحج اور اس کے حلیف قبائل اس کی پرستش کرنے لگے۔

اسی طرح مالک بن مرثد بن جشم کو یعوق نام کا بت ملا۔ وہ ایک گاؤں میں رکھا گیا جس کا نام خیوان تھا جشم قبیلہ ہمدان اور اس کے یمنی حلیف اس کی پوجا کرتے۔

ذی الکلاع کے ایک شخص معدیکرب کو نسر نام کا بت ملا۔ یہ بت سرزمین سبا کے موضع بلخع میں تھا جس کو قبیلہ حمیر اور اس کے حلیف دوست پوجتے تھے۔

حضورؐ کے زمانہ میں یہ سارے بت مسمار کر دیے گئے۔

کہا جاتا ہے کہ عمرو بن لحی جب خانہ کعبہ کا متولی تھا تو ایک مرتبہ سخت بیمار ہوا۔ اسے بتایا گیا کہ شام میں ایک گرم چشمہ ہے۔ اگر تو جا کر اس میں نہائے تو اچھا ہو جائے گا۔ جو وہاں جا کر نہایا تو صحت یاب

ہوگیا۔ اس نے وہاں کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ مورتیں پوجتے ہیں۔ اس نے ان سے پوچھا کہ یہ کیا چیز یں ہیں تو انہوں نے کہا کہ ہم ان سے بارش پاتے ہیں اور ان کی مدد سے دشمنوں پر غالب آتے ہیں۔ ابن لحی نے ان سے ایک بت مانگا جو انہوں نے دے دیا۔ وہ اس کو مکہ لایا اور خانہ کعبہ کے پاس نصب کر دیا۔ اس طرح اس بت کی بھی پرستش شروع ہوگئی۔ اس کا نام ہبل تھا۔

سب سے پرانا بت مناۃ تھا جو قدید میں مکہ اور مدینہ کے درمیان بنایا گیا تھا۔ سب اس کی تعظیم کرتے تھے۔ اس کے لیے قربانی کرتے اور چڑھاوے چڑھاتے۔ سب سے زیادہ تعظیم اوس و خزرج کرتے تھے۔ جو لوگ حج کے لیے آتے تھے وہ مکہ سے روانہ ہونے کے بعد مناۃ کے پاس جا کر سر منڈاتے اور وہاں کچھ دیر قیام کرتے تھے۔ اس کے بغیر ان کا حج مکمل نہیں ہوتا تھا۔ مناۃ قبیلہ ہذیل اور خزاعہ کا بت تھا۔ فتح مکہ کے سال میں حضورؐ نے حضرت علیؓ کو بھیج کر اس کو منہدم کرا دیا تھا۔

مناۃ کے بعد لوگوں نے لات نکالا جو مناۃ کی نسبت جدید تھا اور طائف میں ایک بڑے مربع پتھر پر بنایا گیا تھا۔ قبیلہ ثقیف کے لوگ اس کے مجاور تھے۔ انہوں نے اس پر عمارتیں بھی بنائی تھیں۔ قریش اور تمام عرب اس کی عبادت کرتے تھے۔ زید اللات اور تیم اللات وغیرہ نام رکھتے تھے۔ اب جہاں مسجد طائف ہے اس کے بائیں منارہ کے مقام پر یہ بت نصب تھا۔ جب بنو ثقیف ایمان لے آئے تو حضورؐ نے مغیرہؓ بن شعبہ کو بھیجا جنہوں نے اس کو مسمار کر کے آگ میں جھونک دیا۔

ظالم بن اسعد نے عزیٰ کا بت تراشا اور ذات عرق سے اوپر نخلہ شامیہ کی وادی میں اس کو نصب کر کے اس پر کوٹھری بنائی۔ یہ لوگ اس کی آواز سنا کرتے تھے۔ عزیٰ ایک شیطان صفت عورت تھی۔ حضورؐ کے حکم پر حضرت خالدؓ بن ولید نے اس بت کو مسمار کیا۔

قریش کے بہت سے بت خانہ کعبہ کے اندر اور باہر تھے اور سب سے بڑا ان کے نزدیک ہبل تھا۔ قریش کو عرب میں بڑا مقام حاصل تھا۔ تمام قبائل ان کی عزت کرتے تھے۔ قریش کا یہ طریقہ تھا کہ جس قبیلہ سے ان کے تعلقات استوار ہوتے تھے ان کے بت خانہ کعبہ کے اندر یا باہر لا کر رکھ دیتے تھے۔ اس طرح خانہ کعبہ میں سینکڑوں بت جمع ہو گئے تھے۔ ان میں سب سے بڑا ہبل تھا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ سرخ یاقوت کا انسان کی شکل کا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ ٹوٹا ہوا تھا۔ قریش کو یہ اسی صورت میں ملا تھا۔ انہوں نے اس کا ہاتھ سونے کا بنا کر لگا دیا تھا۔ سب سے پہلے اس بت کو خزیمہ بن الیاس بن مضر نے نصب کیا تھا اور یہ خانہ کعبہ کے بیچ میں تھا اس کے سامنے سات لکڑیاں بے پھل کے تیر کی شکل میں پڑی رہتی تھیں بعض پر صریح اور بعض پر ملصق لکھا ہوا تھا۔ لوگ جب کسی بچہ میں شک کرتے ہبل کے نام پر چڑھاوے

لے جاتے، پھر ان تیروں سے پانسہ پھینکتے۔ اگر صریح نکلتا تو بچہ کو لے لیتے اور اگر ملصق نکلتا تو بچہ کو دفع کرتے۔ اسی طرح جب کسی امر پر جھگڑتے یا سفر کا قصد کرتے تو ہبل کے پاس جا کر پانسہ پھینکتے۔ ابوسفیان بن حرب نے احد کی لڑائی کے دن اس بت کا نعرہ لگایا تھا۔ اعل ہبل یعنی اے ہبل تیرا دین بلند ہو۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اس کو جواب دو اللہ اعلی و اجل یعنی اللہ تعالیٰ برتر اور بزرگ تر ہے۔

مشرکوں کے بتوں میں سے اساف اور نائلہ بھی تھے۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ یہ دونوں قبیلہ جرہم میں سے ایک مرد اور ایک عورت تھے۔ ان کو اساف بن یعلی اور نائلہ بنت زید کہتے تھے دونوں کا عشق یمن سے شروع ہوا تھا، پھر دونوں حج کو آئے اور ایک رات دونوں خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو خدا کا گھر خالی دیکھ کر دونوں نے بدکاری کی جس پر یہ مسخ ہو کر پتھر بن گئے۔ صبح لوگوں نے انہیں پتھر بنا دیکھا تو انہیں خانہ کعبہ سے باہر گاڑ دیا۔ بعد ازاں قریش اور خزاعہ اور دیگر قبائل نے ان کو پوجنا شروع کر دیا۔ ان دونوں کو خانہ کعبہ کے باہر عبرت کے لیے رکھا گیا تھا۔ لیکن اس کا الٹا اثر ہوا اور یہ معبود بن گئے۔ بعد ازاں ان میں سے ایک کو صفا اور دوسرے کو مروہ کی پہاڑیوں پر نصب کر دیا گیا اور حج پر آنے والے لوگ ان دونوں پہاڑیوں کا طواف کرنے لگے۔

ایک بت ذوالخلصہ تھا جو سفید دودھیا پتھر کا بنا ہوا تھا۔ اس پر تاج کی سی صورت نقش تھی اور مکہ سے سات روز کے فاصلہ پر یمن اور مکہ کے درمیان ایک مکان میں رکھا ہوا تھا۔ اس کی بھی تعظیم ہوتی تھی اور چڑھاوے کی قربانی بھیجی جاتی تھی۔ خثعم اور باہلہ اس کی عبادت کرتے تھے اور قربانی پیش کرتے تھے۔ حضورؐ نے جریر بن عبداللہ بجلی کو اس کو مسمار کرنے کے لیے بھیجا۔ خثعم اور باہلہ نے ان کو روکا تو جریر اور ان کے سواروں نے مقابلہ کے بعد ان کو بھگا دیا اور ذوالخلصہ کی عمارت کو آگ لگا دی اور بت کو منہدم کر دیا۔ ذوالخلصہ اب مسجد تبالہ کا چوکھٹ ہے یعنی جس جگہ بت نصب تھا اس کو چوکھٹ بنا دیا گیا ہے۔

قبیلہ اوس کا ایک بت تھا جس کو ذوالکفین کہا جاتا تھا۔ جب وہ لوگ ایمان لائے تو نبیؐ نے طفیل بن عمرو کو بھیجا انہوں نے اس کو جلا دیا۔

بنی حارث بن یشکر کا ایک بت تھا جس کو ذوالشریٰ کہتے تھے۔ خزاعہ ولخم وجذام وعاملہ کا ایک بت مشارف شام (دیہات) میں تھا اس کو اُقیصر کہتے تھے۔

مزینہ کے بت کا نام نہم تھا اسی کے نام پر اس کے پوجنے والوں کے نام عبدنہم لیے جاتے تھے۔

قبیلہ عنزہ کے بت کا نام سعیر تھا۔

قبیلہ طی کے بت کو فلس کہتے تھے۔

مولانا امین احسن اصلاحی

کیا انسان مجبور ہے یا با اختیار؟

سوال: آپ نے اس روایت کو کوئی اہمیت نہیں دی کہ اللہ تعالیٰ نے پشت آدم پر ہاتھ پھیرا اور اس میں سے آدم کی اولاد کے دو گروہ نکالے جن میں سے ایک جنت میں جائے گا، دوسرا دوزخ میں داخل ہوگا۔ یہ حدیث مشکوٰۃ شریف میں ہے۔ آٹھ محدثین نے اس کی تصدیق کی ہے اور اس کی مفید تشریحات کی ہیں جن سے کافی شبہات دور ہو جاتے ہیں۔ آپ شبہات پیدا کرتے ہیں سوائے فکری انتشار کے آپ کو کیا حاصل ہوتا ہے۔

جواب: آٹھ محدثین کی تشریحات سے آپ کے شبہات دور ہو گئے ہوں گے لیکن مجھے شبہ اس لیے ہے کہ یہ روایت عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے۔ عقل یہ جانتی ہے کہ پوری دنیا میں نیکی اور بدی کی جزئیات پر تو اختلاف ہو سکتا ہے مگر کلیات میں کوئی فرق نہیں۔ ہر انسان مانتا ہے کہ ظلم بری چیز ہے جبکہ عدل اچھی صفت ہے۔ سچ بولنا نیکی ہے اور جھوٹ بولنا ایک برائی ہے۔ کسی کا حق نہیں چھیننا چاہیے، کسی کو تکلیف نہیں پہنچانی چاہیے کیونکہ یہ زندگی کے برے رویے ہیں۔ نیکی اور بدی کے یہ بنیادی اصول ہر شخص کو معلوم ہیں اور وہ خواہش رکھتا ہے کہ اس سے دوسرے ہر شخص کا معاملہ نیکی اور عدل وانصاف کی بنیاد پر ہو، خواہ وہ خود دوسروں پر ظلم کرتا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اولاد آدم کے دونوں گروہ نیک وبد کا علم رکھتے ہیں اور ان میں امتیاز کرنے کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہیں۔ اگر ایسا ہے تو یہ دونوں گروہ جنت یا دوزخ میں داخل ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اب نقل کی طرف آئیے۔ قرآن میں بار بار آیا ہے کہ ہدایت کی طلب اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں رکھ دی ہے۔ پھر اس نے انبیاء مبعوث کیے اور ان کے ذریعے مزید ہدایت بھیجی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہر انسان نیکی کی راہ اختیار کرے اور بھلے کام کرے۔ اسی مضمون کی حامل وہ حدیث ہے جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ ہر پیدا ہونے والا نیک فطرت پر پیدا ہوتا ہے، افراد خانہ اور معاشرہ اس کو بگاڑنے کا باعث بنتے ہیں۔ قرآن نے ہدایت اور ضلالت کے وہ اصول بھی بیان کر دیے ہیں جن کے تحت کوئی شخص جنت یا دوزخ میں، جس کا مستحق ٹھہرے گا، اس کو اس میں داخل کیا جائے گا۔ قرآن میں جہاں یہ بتایا ہے کہ بعض لوگوں کے دلوں پر مہر کر دی جاتی ہے اور وہ بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیے جاتے ہیں وہاں یہ بھی بتایا

گیا ہے کہ ہم نے ان کو دل و دماغ دیے لیکن ان سے انہوں نے کام نہیں لیا۔ عقل دی تو اس سے انہوں نے غور وفکر میں مدد نہیں لی، کان دیے تو انہوں نے حق بات سننے کے لیے ان کو استعمال نہیں کیا۔ آنکھیں دیں تو ان سے انہوں نے حقائق کا مشاہدہ نہیں کیا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کی ان صلاحیتوں پر مہر کر دی اور ان پر ضلالت مسلط کر دی۔ قرآن نے یہ بھی بتا دیا کہ یہ مہر فاسقوں پر کی جاتی ہے۔ گویا فاسق وہ ہوا جس کو دنیا میں حق بتایا گیا ہو اور وہ اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو جائے۔

روایت کی رو سے تو فاسق پشت آدم ہی سے پیدا کر دیے گئے تھے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں سے ٹھپا لگا کر ان کو دنیا میں بھیجا گیا کہ یہ دوزخ کے لیے ہیں۔ اس صورت میں تو اللہ تعالیٰ کا قائم کردہ سلسلہ انبیاء بھی غیر ضروری ہو جاتا ہے اور دنیا کے دار الامتحان ہونے کا جو تصور دیا گیا ہے اس کی بھی نفی ہو جاتی ہے۔ جب یہ روایت عقل ونقل دونوں کے خلاف ہے تو اس کی تصدیق آٹھ نہیں، سولہ محدثین بھی کریں تو میرا شبہ برقرار رہے گا۔

ایک بات اور بھی سمجھ لیجیے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے وہ کر سکتا ہے۔ سب انسانوں کو دوزخ میں ڈالنا چاہے تو ڈال سکتا ہے اور سب کو جنت میں داخل کرنا چاہے تو کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ لیکن اس کی مشیت حکمت کے تحت کام کرتی ہے۔ یہ پابندی کسی دوسرے نے اس پر نہیں لگائی بلکہ اس نے خود یہ پابندی عائد کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو لوگ حق کی مخالفت کریں گے، گمراہی کا راستہ اختیار کریں گے میں ان کو جہنم میں جھونک دوں گا اور جو لوگ نیکی کریں گے، ہدایت کی راہ اختیار کریں گے تو ان کو جنت میں داخل کروں گا۔ اب آپ عقل سلیم سے غور فرمائیے کہ جو اصول اللہ تعالیٰ نے خود بتایا اور اس کا اعلان کیا ہے آخر وہ خود ہی اس کی خلاف ورزی کیوں کرے گا۔

رہ گئی یہ بات کہ میری باتوں سے فکری انتشار پیدا ہوتا ہے تو میرے نزدیک اس سے انتشار پیدا نہیں ہوتا بلکہ سلامتی کا راستہ پیدا ہوتا ہے۔ انتشار تو اس کے اندر ہوگا جس میں تضاد ہو۔ میرے اندر کوئی تضاد نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اپنی بات کی دلیل قرآن میں بھی پاتا ہوں اور عقل کے اندر بھی۔ اور میں یہ جانتا ہوں کہ علم کی اصل کسوٹی قرآن ہے جو بالکل محفوظ ہے۔ دین کے متعلق کوئی چیز اس آسمان کے نیچے ہم قرآن کے منافی نہیں مان سکتے۔ میں لوگوں کی حماقتوں اور بوالفضولیوں کو دیکھ کر چپ ہو جاؤں تو یہ کرنے کے لیے میں تیار نہیں ہوں۔ مجھے کوئی لیڈری نہیں کرنی ہے۔ میں تو ایک طالب علم ہوں اور ایمانداری کے ساتھ طالب علم ہی رہنا چاہتا ہوں۔ میں حدیث کی کتابیں اس بڑھاپے اور پیری میں بھی پڑھتا ہوں۔ جن حدیثوں میں اور قرآن میں اختلاف نظر آتا ہے ان پر غور کرتا ہوں اور اختلاف کو رفع

کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر یہ کوشش ناکام ہو جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ روایت قرآن کے منافی ہے تو پھر سردھڑ کی بازی لگا کر اس حقیقت کو بیان کر دیتا ہوں۔ میں اسی طریقہ پر کام کرتا رہوں گا۔ مجھے اپنے رب کے سوا، اس کی کتاب کے سوا اور اپنے دین کے سوا کسی چیز کی پروا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز مجھے دے رکھی ہے اور سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ اس نے مجھے اطمینان قلب دے رکھا ہے۔

لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اس روایت کو بھی صحیح مانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جان قبض کرنے کے لیے ملک الموت آئے تو موسیٰ نے ان کو اتنے زور سے تھپڑ مارا کہ ان کی آنکھ نکل پڑی۔ میں نے ایک مضمون میں لکھا کہ اس طرح کی روایات پر تنقید کر کے ان کو کتب حدیث سے نکال دینا چاہیے۔ اس پر ایک جلیل القدر محدث نے مجھے جہمیہ کا ایک فرد بنا دیا اور لکھا کہ تمہیں معلوم نہیں کہ ملک الموت حضرت موسیٰ کے پاس روح قبض کرنے کے وقت سے پہلے چلے گئے تھے۔ اس پر ان کو غصہ آ گیا تو انہوں نے فرشتے کو تھپڑ رسید کر دیا۔ میں نے ان محدث کو لکھا کہ مولانا! اب میں مطمئن ہو گیا۔ مجھے گمان تھا کہ موت کے اوقات کا علم ملک الموت کو زیادہ ہوتا ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ کو اس کا زیادہ پتا تھا اور ملک الموت غلطی پر تھے۔

انسانی فطرت اور حیوانی جبلت میں فرق:

سوال: انسان جب فطری طور پر نیکی کی طرف راغب ہے تو انسانوں کی اکثریت حق کا انکار کیوں کرتی ہے؟

جواب: یہ بات یاد رکھیے کہ انسان کی فطرت اور حیوانات کی جبلت میں فرق ہے۔ بیل گھاس پھونس کھاتا ہے، وہی کھائے گا۔ آپ اس کے سامنے مرغ بھون کر رکھ دیجیے وہ اس کو دیکھنا تک بھی گوارا نہ کرے گا۔ اس لیے کہ اس کی جبلت اس سے مناسبت نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس انسان کا حال یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر خوش ذوق کوئی نہیں اور اس سے بڑھ کر بدذوق بھی کوئی نہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ اس کی فطرت جبلت کی طرح پابند نہیں ہے۔

انسان کو ایک اور شرف اختیار کا ملا ہوا ہے۔ اختیار حاصل ہونے کے باعث وہ رشک ملائکہ ہے۔ اسی اختیار کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس کے صحیح استعمال سے وہ ابوبکر صدیق اور عمر فاروق بن جاتا ہے لیکن جب وہ اس کا غلط استعمال کرتا ہے تو ابوجہل اور ابولہب بھی بن جاتا ہے۔ یہ اختیار بہت بڑی نعمت ہے۔ البتہ اس کے صحیح استعمال کی راہ میں بہت کڑے امتحانوں سے سابقہ پیش آتا ہے جن سے پہلوتہی

کرنے کی کوشش میں انسان غلط راہ کا انتخاب کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اگرچہ نیک فطرت پر پیدا ہوتا ہے لیکن اپنی کم ہمتی کے باعث حق سے دور ہو جاتا ہے۔

ہمارے بعض اہل دین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انسان مجبور ہے، اسے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ لیکن قرآن جگہ جگہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اختیار دے رکھا ہے، چاہے تو ایمان لائے، چاہے کفر کی راہ پر چلے۔ اسی بنا پر آخرت میں محاسبہ کا جواز بنتا ہے۔ جہاں تک دنیاوی معاملات کا تعلق ہے ان میں بھی آپ کو اختیار حاصل ہے۔ آپ ارادہ کر سکتے ہیں۔ اس کو بروئے کار لانے کے لیے تدابیر بھی کر سکتے ہیں لیکن آپ کے ارادہ اور تدابیر کو نتیجہ خیز بنانا اللہ کے اختیار میں ہے۔

پہلے مجھے اس مسئلہ کی سنگینی کا احساس نہیں ہوا۔ میں نے جب خواجہ حافظ کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے اس مضمون کو بہت غلط کر دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے سخت پریشانی ہوئی۔ آدمی تو بھلے تھے، شاعری کے زعم میں فضولیات کہہ گئے۔ ان کا خیال ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔ ہم کیا کرتے ہیں؟ ان کو یہ علم نہ ہو سکا کہ اللہ تعالیٰ اگر کرتا ہے تو اس نے کرنے کا طریقہ کیا رکھا ہے۔ اس کو خوب اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ آپ غور کریں گے، فکر کریں گے، ارادہ کریں گے، اس کے بعد اچھا یا برا راستہ اختیار کریں گے۔ جس راستے کا آپ نے انتخاب کیا ہوگا اللہ تعالیٰ اس پر چلنے کا آپ کو موقع دے گا۔ اچھا راستہ اختیار کریں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق دے گا۔ آگے بڑھنے میں مدد دے گا، کوئی مشکل عبور کریں گے تو آپ کا درجہ اونچا کرے گا۔ اسی طرح سے اگر آپ آنکھ بند کر کے برائی کے پیچھے چلنا چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ ڈھیل دے گا اور چاہے گا تو اس میں آگے بڑھنے کے اسباب فراہم کر دے گا۔ کرنے کو اللہ تعالیٰ جو چاہے کر سکتا ہے لیکن وہ کرتا وہی ہے جو اس کے قانون کے مطابق ہوتا ہے، اس کی حکمت جس کا تقاضا کرتی ہے اور جو عدل پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کو یوں تعبیر کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت مقید بالحکمت ہے۔

تفسیر تدبر قرآن اور معتزلی فکر:

سوال: آپ بڑی آسانی سے معتزلہ کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں جبکہ علماء ان کو ایک گمراہ فرقہ قرار دیتے ہیں۔

جواب: معتزلہ سے جو سوء ظن علماء کو ہے وہ مجھے کبھی نہیں رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر کوئی میرے بارے میں یہ کہے کہ یہ معتزلی ہے تو میں اس کو گالی نہیں سمجھتا۔ ہاں، اگر مجھے اشعری کہا جائے تو میں اس نسبت سے ڈرتا اور شرماتا ہوں۔ میں اشعری کہلانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

بعض لوگوں کا دعویٰ تو یہ ہے کہ میں نے تفسیر تدبر قرآن معتزلہ کو پڑھ کر اور ان سے سیکھ کر لکھی ہے لیکن بتاتا نہیں ہوں۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ معتزلہ کی کوئی کتاب آج موجود نہیں۔ ان کی کتابیں تو جلا دی گئی تھیں۔ ایک علامہ زمخشری کی تفسیر کشاف موجود ہے۔ زمخشری کو یہ لوگ معتزلی کہتے ہیں۔ اگر کوئی صاحب میری چوری پکڑنا چاہتے ہوں تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ آیت بسم اللہ سے لے کر سورہ الناس تک میری تفسیر اور تفسیر کشاف کا مقابلہ کریں اور دکھائیں کہ فلاں آیت کی تفسیر سے چوری ثابت ہوتی ہے۔ اس طرح میری چوری سر بازار پکڑی جائے گی۔

تدبر قرآن لکھنے کے دوران میری میز پر رازی کی تفسیر رہی ہے جو اشاعرہ کے امام ہیں۔ ابن جریر کی تفسیر رہی ہے جو روایات کے امام ہیں۔ ابن کثیر کی تفسیر رہی ہے جو ابن تیمیہ کے اسکول کی نمائندہ ہے اور زمخشری کی تفسیر رہی ہے جسے معتزلہ کی نمائندہ تفسیر کہا جاتا ہے۔ غور و فکر اور ذاتی تحقیق اپنی جگہ، لکھتے وقت میں ان تفاسیر کو ضرور پڑھ لیتا تھا۔ زمخشری نحوی ہے۔ میں نحو سے متعلق اس کی چیزیں پڑھتا رہا ہوں۔ ممکن ہے کہیں میں نے اس کی رائے کو درست مانا ہو، ورنہ نحو میں بھی زیادہ اہمیت میں نے اپنے استاذ رحمہ اللہ کی تحقیقات کو دی ہے اور کہیں سیبویہ کی رائے سے استفادہ کیا ہے۔

قرآن اور سائنس کا تعلق:

سوال: اس زمانہ میں لوگ قرآن سے سائنس اخذ کر رہے ہیں۔ اس بارے میں آپ کا نقطہ نظر کیا ہے؟

جواب: اس زمانہ میں چونکہ لوگ سائنس سے زیادہ مرعوب ہیں اس لیے وہ تمام فلسفہ پر بھی غالب آنا چاہتے ہیں اور مذہب کی تعلیم کو بھی سائنس کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے ہیں۔ بعض لال بجھکو سائنس کو قرآن مجید میں تلاش کر رہے ہیں۔ یہ بات سائنس دانوں کو سمجھانی پڑے گی کہ قرآن مجید کا اور فلسفہ کا موضوع تو بلاشبہ مشترک ہے لیکن سائنس کا اور قرآن کا مشترک نہیں ہے۔ فلسفہ سے میری مراد یونانی فلسفہ ہے یعنی سقراط اور ارسطو کا فلسفہ۔

سائنس، فلسفہ اور مذہب تینوں میں قدیم یونانیوں کو گھپلا پیش آیا۔ سقراط پہلا شخص ہے جس نے متنبہ کیا کہ سائنس اور فلسفہ دو الگ الگ موضوع ہیں۔ سائنس اور فلسفہ دونوں جب تک ملے ہوئے تھے تو یکسو ہو کر نہ اچھے فلسفی پیدا ہوتے تھے اور نہ یکسو ہو کر اچھے سائنس دان پیدا ہوتے تھے۔ اس مردِ حق نے، جو خود فلسفہ کا امام تھا، نہ خود سائنس میں دلچسپی لی اور نہ اس کے شاگرد افلاطون نے لی۔ سقراط نے واضح کیا کہ

سائنس کے مسائل الگ ہیں۔ اس بات پر ضرور غور کرو کہ پانی کیا چیز ہے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ اس کائنات کی حقیقت کیا ہے، صداقت کیا ہے، نیکی کیا ہے، بدی کیا ہے۔ سقراط کے بعد سے فلسفہ کا رخ بدلا۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے وہ یہ بحث نہیں کرتا کہ پانی کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔ یہ مفرد ہے یا مرکب، اگر مرکب ہے تو کن اجزا سے مرکب ہے۔ اس کا کیا مزاج، کیا خواص اور کیا اثرات ہیں۔ وہ اپنی بات آفاق اور انفس پر مبنی کر کے اس بات پر غور کی دعوت دیتا ہے کہ اس کائنات کی اصل حکمت کیا ہے، اس کا صانع کیسا ہے، اس کی صفات کیا ہیں، ان صفات کے تقاضے کیا ہیں، صانع کی پسند اور ناپسند کا اندازہ اس کی صنعت سے کیا ہوتا ہے۔ اس کائنات کا حاصل اور انجام کیا ہے۔ یہ بس یوں ہی ختم ہو جائے گی یا اس کے بعد بھی کوئی دن ہے۔ اگر ایسا دن ہے تو اس میں کیا ہوگا۔ وغیرہ۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی بات سائنس کے مقابل نہیں بلکہ آپ کے فلسفہ، نفسیات، سیاسیات اور مابعد الطبیعیات کے مقابل ہوتی ہے۔ اس میں قرآن کا اپنا فلسفہ بیان ہوتا ہے۔ قرآن پورے اعتماد اور قوت کے ساتھ اپنے دلائل دیتا ہے۔ وہ ان مسائل کو واضح کرتا ہے جن پر عموماً انسان غور نہیں کرتا اور ان کی طرف اس کی توجہ نہیں ہوتی۔ توجہ نہ ہونے کی یہ وجہ نہیں ہے کہ آپ کے پاس عقل نہیں ہے۔ عقل تو ہے لیکن ان مسائل کا نفع نقد نہیں ہے۔ ان پر غور کرنے کے لیے اگر دماغ میں کبھی ہیجان پیدا بھی ہوتا ہے تو آدمی سوچتا ہے کہ غور کر لیں گے، ابھی جلدی کیا ہے۔ سائنس سے متعلق امور کے لیے آدمی کے اندر Urge موجود ہے۔ اس لیے قرآن نے اس کو موضوع نہیں بنایا۔ خدا نے جتنی عقل دی ہے وہ اس بات کے لیے کافی ہے کہ نفع حاصل کرنے کے لیے آپ اشیا کے بخیے ادھیڑتے رہیے اور ان کو اپنے لیے کار آمد بنائیے۔

تحدید نسل کی منصوبہ بندی:

سوال: تحدید نسل کے لیے عزل، مرد کا آپریشن، عورت کا اسقاط حمل اور منصوبہ بندی کے دوسرے طریقے، جو مراکز صحت میں بتائے جاتے ہیں، کیا یکساں طور پر قابل اعتراض ہیں؟

جواب: تحدید نسل کے یہ تمام طریقے پاگل پن کے لحاظ سے ایک ہی فہرست میں شامل ہیں۔ اس دنیا کی مشکلات ان خرافات سے حل نہیں ہو سکتیں۔ انسان کی یہ سوچ ہی احمقانہ ہے کہ اتنی روٹی اور اتنی بوٹی ہوگی تو ہم اتنے بچے پیدا کر سکتے ہیں۔ اس معاملہ میں حکومت کا کوئی رول ہے تو یہ ہے کہ وہ بتائے کہ اولاد پیدا کرنے میں صحت کے آداب کیا ہیں جن کا لحاظ ضروری ہے۔ بچوں کی تربیت سے متعلق والدین کی ذمہ

داری کیا ہے اور اس کو کیسے ادا کرنا چاہیے۔ اس بارے میں ضروری معلومات سکولوں کے نصاب میں بھی ہونی چاہئیں اور بڑوں کے لیے تربیت گاہیں بھی منعقد کی جا سکتی ہیں۔ یہ باتیں ہمارے اور آپ کے فرائض میں ہیں۔ روٹی دینا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ افزائش کے لحاظ سے جس رفتار سے آبادی بڑھ رہی ہے اس سے زیادہ رفتار سے زمین کے خزانے ابلتے آ رہے ہیں۔ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ وہ نظام قائم نہیں ہے جو لوگوں کو انصاف کے ساتھ معاش کی سہولتیں فراہم کر سکے۔ جو حکمران بنتے ہیں ان کو اپنے مفادات عزیز ہوتے ہیں۔ اگر آپ کو پتہ چلے کہ کتنا روپیہ یہ لوگ لوٹ رہے ہیں تو آپ حیران رہ جائیں۔ جو کام حکومت کے کرنے کے ہیں ان کی ان کو توفیق نہیں ہوتی۔ اگر یہ صحیح کام کریں تو اللہ کے فضل سے کتنی چیزیں عام دولت کی ایسی ہیں جن کا آج ہم تصور بھی نہیں کر سکتے لیکن وہ وجود میں آ جائیں گی۔ اگر لوٹ کھسوٹ اور اسراف ہی پر قابو پا لیا جائے تو ملک میں خوشحالی لائی جا سکتی ہے۔ آج کل جو بوفے کی دعوتیں ہوتی ہیں ان میں ایک مہذب آدمی کیسے جائے۔ میرا ایک ایسی ہی دعوت میں جانا ہوا۔ وہاں مظاہرہ اس چیز کا تھا کہ دیکھیے، کتنی بڑی بڑی بوٹیاں ہیں جن کو اس قدر مہارت سے گلا دیا گیا ہے کہ ٹوٹنے نہیں پائیں۔ میں نے کہا 'جی، اس سے زیادہ قابلیت تو ان معدوں میں ہوگی جو ان کو ہضم کر جائیں گے'۔ پھر میں نے کہا ذرا ان سے پوچھیے کہ وہ گرانی اور قحط و افلاس کہاں ہے جس کا شور اخباروں میں ہے۔ یہاں تو وہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ جس ملک میں غذائی قلت اور افلاس ہے اور آبادی کا بہت بڑا حصہ غربت کی نچلی سطح پر زندگی گزار رہا ہے، وہاں اس طرح کی تقریبات کا کوئی جواز نہیں۔ یہ فاسقانہ تمدن ہے۔

یاد رکھیے کہ اسلام دین فطرت ہے۔ ہر معاملے میں فطرت کی حدود میں رہیے۔

(ترتیب: سید اسحاق علی)

اشاریہ مضامین

"تدبر" شمارے 71 تا 80

نمبر شمار	مضمون / عنوان	تالیف / مرتب	شمارہ نمبر
۱۔	**تدبر قرآن**		
	نظام القرآن / تفسیر سورہ بقرہ	امام حمید الدین فراہی / ڈاکٹر عبید اللہ فراہی	74 تا 80
۲۔	**اسالیب القرآن**		
	مخاطب کو متوجہ اور متنبہ کرنے والے اسالیب	خالد مسعود	72
۳۔	**تدبر حدیث**		
الف	**صحیح بخاری**		
	کتاب البیوع کی روایات	امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی	71-72
	کتاب الاجارات کی روایات	امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی	73
	کتاب الکفالہ کی روایات	امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی	74
	کتاب الوکالہ کی روایات	امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی	74 تا 76
	کتاب المزارعہ کی روایات	امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی	76 تا 78
	کتاب المساقات کی روایات	امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی	79-80
ب۔	**موطا، امام مالک**		
	کتاب الصیام کی روایات	امین احسن اصلاحی / احسان الحق / سعید احمد / سید اسحاق علی	71-73
	کتاب الطہارۃ کی روایات	امین احسن اصلاحی / ماجد خاور	74 تا 76
	کتاب جامع الوضوء کی روایات	امین احسن اصلاحی / ماجد خاور	77 تا 79
	کتاب الاعتکاف کی روایات	امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی	80

۴۔ تذکرہ وتبصرہ

صاحب تدبر قرآن کو خراج تحسین	خالد مسعود	71
پاکستان میں سودی نظام کا خاتمہ	عبداللہ غلام احمد	72
مولانا اصلاحی پر رسالہ محدث کا ناروا حملہ	خالد مسعود	73
انتم الاعلون ان کنتم مومنین	عبداللہ غلام احمد	74
پاکستان میں اسلامی حکومت کا نعرہ	عبداللہ غلام احمد	75
تدبر حدیث شرح صحیح بخاری	عبداللہ غلام احمد	76
اجتماعی دانش کو بروئے کار لانے کی ضرورت	محبوب سبحانی	77
ایک مخلص خادم اسلام کی رحلت	خالد مسعود	78
جنگ عراق کے چند قابل توجہ پہلو	خالد مسعود	79
کتب فراہی اور خدمت حدیث	خالد مسعود	80

۵۔ مقالات

نبی ﷺ کی تربیت کا نظام	خالد مسعود	72-71
تحقیق فقہ کا اصلاحی منہاج	عبدالخالق فاروقی	71
علوم اسلامی کی تجدید میں مولانا اصلاحی کا کردار	اختر حسین عزمی	71
آخرت کے بارے میں مغالطے	محبوب سبحانی	72-71
رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا آغاز	خالد مسعود	73
شفاعت کا صحیح اور غلط تصور	محبوب سبحانی	73
اہل محدث کے نام	منظور الحسن	73
رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں قریش کی منصوبہ بندی	خالد مسعود	74
رسول اللہ ﷺ کی شخصیت پر اعتراضات	خالد مسعود	75
نظام نبوت ورسالت	خالد مسعود	76
رسول اللہ ﷺ کی بعثت عام اور ختم نبوت	خالد مسعود	77

قرآن مجید کی جمع وتدوین	خالد مسعود	78
رسول اللہ ﷺ کے فرائض اور ذمہ داریاں	خالد مسعود	79
بت پرستی کی تاریخ	محبوب سبحانی	80

۶۔ مراسلہ ومذاکرہ

کیا سیکولر ریاستوں سے ہجرت کر جانا مناسب ہے	امین احسن اصلاحی/سید اسحاق علی	74
افغانستان میں مجاہدین کی جدوجہد	امین احسن اصلاحی/سید اسحاق علی	74
مال غنیمت کی تقسیم کا حکم	امین احسن اصلاحی/سید اسحاق علی	74
انفاق کی بہتر صورتیں	امین احسن اصلاحی/سید اسحاق علی	74
شکر نعمت	امین احسن اصلاحی/سید اسحاق علی	75
خیر یا شر کی صلاحیت	امین احسن اصلاحی/سید اسحاق علی	75
اللہ تعالیٰ کی تدبیر کا مفہوم	امین احسن اصلاحی/سید اسحاق علی	75
سائنسی تحقیقات سے مرعوبیت	امین احسن اصلاحی/سید اسحاق علی	75
مطالعہ حدیث کے لیے موزوں کتاب	امین احسن اصلاحی/سید اسحاق علی	75
پکی قبروں کی ممانعت	امین احسن اصلاحی/سید اسحاق علی	75
اللہ تعالیٰ کی صفت تکبر کا مفہوم اور اس کا تقاضہ	امین احسن اصلاحی/سید اسحاق علی	77
فطرت کا مفہوم	امین احسن اصلاحی/سید اسحاق علی	77
بے انصافی سے تنگ آ کر فعل حرام کا ارتکاب	امین احسن اصلاحی/سید اسحاق علی	77
قرآن میں بنی اسرائیل کے تفصیلی حالات بیان کرنے کا سبب	امین احسن اصلاحی/سید اسحاق علی	77
گناہ کے ساتھ کلمہ توحید کا اقرار	امین احسن اصلاحی/سید اسحاق علی	77
ناقدین کے ساتھ میرا معاملہ	امین احسن اصلاحی/سید اسحاق علی	77
امی کا مفہوم	امین احسن اصلاحی/سید اسحاق علی	77
حج وقربانی کے بعض مسائل	امین احسن اصلاحی/سید اسحاق علی	77
خواتین کی اصلاح کا طریقہ	امین احسن اصلاحی/سید اسحاق علی	78

خانہ کعبہ پر ابرہہ کا حملہ	امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی	78
رسول اور نبی کا فرق	امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی	78
علامہ اقبال کے متضاد خیالات	امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی	78
نیکی کی راہ سے شیطان کا حملہ	امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی	79
روح اور نفس کا فرق	امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی	79
قدیم صحیفوں کے مطالعہ کا جواز	امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی	79
بدعتی امام کی اقتدا میں نماز	امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی	79
ارسٹوکریسی کی تربیت	امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی	79
ابن خلدون کا فلسفہ تاریخ	امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی	79
داڑھی رکھنے کی اہمیت	امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی	79
شوہر اور بیوی میں ان بن	امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی	79
کیا انسان مجبور ہے یا با اختیار	امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی	80
انسانی فطرت اور حیوانی جبلت میں فرق	امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی	80
تفسیر تدبر قرآن اور معتزلی فکر	امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی	80
قرآن اور سائنس میں تعلق	امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی	80
تحدید نسل کی منصوبہ بندی	امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی	80

۷۔ **افادات اصلاحی**

رویت باری کا مسئلہ	امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی	76

نشر اشاعت

تفسیر قرآن کے اصول

تالیف امام حمید الدین فراہی — ترجمہ و ترتیب خالد مسعود

موضوعات

1- قرآن میں تدبر و تفکر کی دعوت — 2- قرآن مجید کی ترتیب
3- قرآن ایک مربوط کلام — 4- اصول تفسیر [illegible] کی ضرورت
5- اصول تفسیر سے متعلق چند ضروری مباحث — 6- تفسیر قرآن کے اصول
7- اصول تاویل

قیمت /80 روپے

اصول فہم قرآن

مصنف مولانا امین احسن اصلاحی — ترتیب [illegible]

موضوعات

- فہم قرآن کے لیے چند بنیادی اصول
  1- قرآن مجید کی دعوت عقل و فطرت پر مبنی ہے۔
  2- قرآن مجید کی ترتیب اتفاقی نہیں بلکہ توقیفی ہے۔
  3- قرآن حق و باطل کے امتیاز کے لئے کسوٹی ہے۔
  4- قرآن مجید قریش کی ٹکسالی عربی زبان میں نازل ہوا۔
  5- قرآن قطعی الدلالہ ہے۔
- نسخ اور اس کی حکمت
- سورۃ قرآن کے فہم کے لئے اساس

قیمت /34 روپے

اسباق النحو

مصنف خالد مسعود

- مولانا فراہی کی کتاب [illegible] کی ترتیب کے ساتھ
- عربی زبان کے قواعد کی تعلیم کا جدید انداز
- اسم فعل اور حرف کا ضروری تعارف
- ترجمے کے لئے مشقیں

قیمت /36 روپے

ہمارے نزدیک یہ کتاب طالبین کے لئے [illegible] عربی زبان سمجھنے کی راہ ہموار ہو جائے گی۔ مولانا امین احسن اصلاحی

ملنے کا پتہ

1- ادارہ تدبر قرآن و حدیث، رحمان مارکیٹ [illegible]
2- دار التذکیر، رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور